# تبسمِ غم

وسیم بریلوی

# تبسمِ غم

وسیم بریلوی

میری تصویر کے یہ نقش ذرا غور سے دیکھ
ان میں اک دور کی تاریخ نظر آئے گی

"اُن
آنسوؤں
کے
نام
جو
پلکوں
تک
نہیں
پہونچے"

# فہرست


| نمبر شمار | عنوان | صفحہ |
| --- | --- | --- |
| ۱ | "وسیم کی شاعری میں غم اور اُس کا بیان" | ۹ |
| ۲ | "فانوس سے شمع تک" | ۱۲ |
| ۳ | خوب سمجھے حیات کا مفہوم | ۱۷ |
| ۴ | آنکھ میں آنسو ہیں رونے کی تمنا دل میں ہے | ۱۸ |
| ۵ | دلِ مغموم کیسا رونا ہے | ۱۹ |
| ۶ | ڈبو رہا ہے کہاں دردِ عاشقی مجھ کو | ۲۰ |
| ۷ | شام ہوتی ہے منزل ابھی دور ہے | ۲۱ |
| ۸ | خوشبوؤں سے اُترتے ہیں جب سینے میں غم پہلے | ۲۲ |
| ۹ | تمہاری راہ میں ہم زندگی گذار چلے | ۲۳ |
| ۱۰ | نغمۂ غم سے بھی کام چل جائے گا | ۲۴ |
| ۱۱ | دیکھیے دور بدلتا ہے کہ ساقی کی نظر | ۲۵ |
| ۱۲ | اس زمانے سے سفر کرتے اگر کر سکتے | ۲۶ |
| ۱۳ | کب چشمِ الم ہوتی ہے نم دیکھ رہا ہوں | ۲۷ |
| ۱۴ | بمصلحت کبھی اگر دل کی آگ کم ہوگی | ۲۸ |
| ۱۵ | مٹے وہ دل جو ترے غم کو لے کے چل نہ سکے | ۲۹ |
| ۱۶ | ستم کے بعد اگر دعوتِ کرم نہ ملے | ۳۰ |

| صفحہ | عنوان | نمبر شمار |
| --- | --- | --- |
| ۳۱ | وسیم جی چلیے مرنے کا اہتمام کریں | ۱۷ |
| ۳۲ | ستم بخیر تراز نارگی کی شان گئی | ۱۸ |
| ۳۳ | غم میں یوں ڈوبے ہوئے ہم تری محفل سے چلے | ۱۹ |
| ۳۴ | لوٹا جاتا ہے ہر اک قافلہ منزل کے قریب | ۲۰ |
| ۳۵ | چمن سے روکے نہ یوں ہی سحر گئی ہوگی | ۲۱ |
| ۳۶ | شام آئی آنکھ میں اشک آگئے | ۲۲ |
| ۳۷ | تری بزم تک تو آؤں جو یہ آنا راس آئے | ۲۳ |
| ۳۸ | تیری محفل میں لوگوں کے چہرے پہ کیوں میرے اٹھنے سے پہلے اُتر جائینگے | ۲۴ |
| ۳۹ | کب دِل مرا اداس نہیں آنکھ تر نہیں | ۲۵ |
| ۴۰ | داغ آنسوؤں سے دِل کے کیا کیا کہ دھو دیئے | ۲۶ |
| ۴۱ | غموں پہ ہم ہی اگر یوں نہ التفات کریں | ۲۷ |
| ۴۲ | شب میخانہ بھی جب تجھ پہ گراں گذرے گی | ۲۸ |
| ۴۳ | کوئی نکلے ایسا سورج جو یہ رات لے کے جائے | ۲۹ |
| ۴۴ | میرے سامنے آتے چشم نم چھپاتے ہو | ۳۰ |
| ۴۵ | حیات انھیں ملی جن کو غم حیات نہیں | ۳۱ |
| ۴۶ | دِل ہیں اشکوں کی اب نشانی سے | ۳۲ |
| ۴۷ | میری یہ فکر کہ منزل سے اِدھر شام نہ ہو | ۳۳ |

| نمبر شمار | عنوان | صفحہ |
|---|---|---|
| ۳۴ | یہ بزم ہے وہ تبسم اسی رات رات کی | ۴۸ |
| ۳۵ | یہ میرا ظرف ہے کہ بقدر غم حیات | ۴۹ |
| ۳۶ | ترے نہ ہونے سے یوں سوگوار گذری ہے | ۵۰ |
| ۳۷ | صورت بزم کچھ ایسی ترے جاتے ہی بنی | ۵۱ |
| ۳۸ | نہ سوچ کر کبھی انجام ظلم رہی میں نے | ۵۲ |
| ۳۹ | مرے اشک بہہ رہے ہیں کہ چراغ جل رہے ہیں | ۵۳ |
| ۴۰ | اداس وحشتیں تکتی تھیں بام و در سے مجھے | ۵۴ |
| ۴۱ | یوں لگے راہ کو تیری جو کبھی ہم گذرے | ۵۵ |
| ۴۲ | ہر ایک اشک ہے تیرے تری خوشی کے لئے | ۵۶ |
| ۴۳ | اٹھایا جام تو ساقی نے گل کئے وہ چراغ | ۵۷ |
| ۴۴ | وہ سہما سہما تبسم ان کا وہ نیم چشم کرم اٹھا کر | ۵۸ |
| ۴۵ | ابھی بیٹھے بیٹھے میں تھک گیا تھا کہ تیری یاد میں ڈوب کر ذرا سر کو میں نے جھکا لیا | ۵۹ |
| ۴۶ | وہ دل جو تیرے لئے مستقل اداس نہیں | ۶۰ |
| ۴۷ | اشکوں کا اک تار بندھا تھا کچھ دیر رہا اور ٹوٹ گیا | ۶۱ |
| ۴۸ | صرف تیرا نام لیکر رہ گیا | ۶۲ |
| ۴۹ | لب پہ دل کی بات بھی آئی نہیں | ۶۳ |
| ۵۰ | مرے دل کی غم پسندی تو ضرور کم نہ ہوگی | ۶۴ |

| نمبر شمار | عنوان | صفحہ |
|---|---|---|
| ۵۱ | زندگی ہے اور دلِ نادان ہے | ۶۵ |
| ۵۲ | اندھیرے صرف اندھیرے نظر کدھر جائے | ۶۶ |
| ۵۳ | ٹوٹ چلے پھر آنکھ سے آنسو اور ترا دامن پاس نہیں | ۶۷ |
| ۵۴ | راہِ وفا کے فاصلے کچھ معتبر نہ تھے | ۶۸ |
| ۵۵ | خشک آنکھیں ہیں تو دل ہی مرا ویراں سا ہے | ۶۹ |
| ۵۶ | خشک آنکھیں ہیں پلک بھی نم نہیں | ۷۰ |
| ۵۷ | کون سے دل میں کچھ افسانے نہیں | ۷۱ |
| ۵۸ | مسکراتا ہوں دلِ ناکام سے | ۷۲ |
| ۵۹ | ٹھوکروں سے کیوں سکونِ دل نہیں | ۷۳ |
| ۶۰ | اس طرح مرا ذوقِ سفر کھو رہا ہے | ۷۴ |
| ۶۱ | مری شاعری ہے مجھ کو جو تمام کر رہی ہے | ۷۵ |
| ۶۲ | یہی بزمِ عیش ہوگی یہی دورِ جام ہوگا | ۷۶ |
| ۶۳ | تجھے جو دیکھا تو آنکھوں میں آ گئے آنسو | ۷۷ |
| ۶۴ | آج پھر آزمائشِ غم ہے | ۷۸ |
| ۶۵ | نظر میں آئیں گے چہرے نہ جانے کس کس کے | ۷۹ |
| ۶۶ | دیکھ ان آنکھوں میں اک اشک نہ چھوڑا ہم نے | ۸۰ |
| ۶۷ | قطعات | ۸۱ تا ۹۴ |

| نمبر شمار | عنوان | صفحہ |
| --- | --- | --- |
| ۶۸ | **نظمیات** | ۹۵ |
| ۶۹ | "میری تصویر" | ۹۶ |
| ۷۰ | "ماضی" | ۱۰۸ |
| ۷۱ | "بنجارن" | ۱۱۰ |
| ۷۲ | "دیوانے کی جنّت" | ۱۱۴ |
| ۷۳ | "دیوانے دو" | ۱۱۷ |
| ۷۴ | "تیری یاد" | ۱۲۱ |
| ۷۵ | "شورروم سے گل مرگ تک" | ۱۲۴ |
| ۷۶ | "آندھی کا بہاؤ" | ۱۳۰ |
| ۷۷ | "آنسو فروش" | ۱۳۶ |
| ۷۸ | "مقدس خون" | ۱۳۸ |
| ۷۹ | "خط اور خوشبو" | ۱۴۲ |
| ۸۰ | "امانت" | ۱۴۵ |
| ۸۱ | "کھلونا" | ۱۵۱ |
| ۸۲ | "وہ پاؤں" | ۱۵۲ |
| ۸۳ | "جواں منظریں" | ۱۵۵ |
| ۸۴ | "ایک خط کا منظوم جواب" | ۱۵۸ |

# وسیم کی شاعری میں غم اور اُس کا بیان

نشورؔ واحدی

اُردو شاعری میں غم کے مضامین بہت ملتے ہیں مگر اس قدر حسین غم "شیریں غم" جیسا کہ وسیم کی غزلوں میں ملتا ہے۔ شاید ہی کہیں اور مل سکے ــــ غزلوں کی زبان بڑی سلیس دلکش اور شیریں ہے ــــ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بیانِ غم میں یہ شیرینیِ زبان کی ہے یا محبت کے دلدوز مضمون کی ــــ یہ مٹھاس شربت کی ہے یا خون دل کی ــــ ایک شاعر تو یہی محسوس کرتا ہے کہ یہ حلاوت اسی نغمے کی ہے جسے "شکست شیشۂ دل" کہتے ہیں ــــ

وسیم کی غزلوں میں ایک رُکی تھمی سی کیفیت ملتی ہے ــــ جو ایک طویل داستانِ غم کا عنوان ہے۔ ان کا غم خاموش اور گہرا ہے ۔ اس کی گرفت بھی ڈھیلی ڈھالی نہیں۔ اس کے پنجے "رگِ جاں" سے اُلجھے ہوئے ہیں جس سے چھوٹنا محال ہے۔

ان کے شعور میں ایک خاص قسم کی لچک ہے۔ جو مزاج کی نرمی اور گرمی دونوں سے مل کر ترتیب پاسکی ہے۔ پھر قدرت نے ان کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا ایسا سلیقہ عطا کیا ہے۔ جو روایاتِ شعر و ادب کا نچوڑ ہے۔

ان سب صلاحیتوں نے مل کر ان کے بیانِ غم کو ایسی تاثیر اور دلکشی بخشی ہے جس کی مثال شعرائے "عصرِ حاضر" میں کمیاب یا نایاب ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

میں اُن چراغوں کی عمرِ وفا کو روتا ہوں
جو ایک شب بھی مرے دل کے ساتھ جل نہ سکے

ہم غم نصیب لوگوں کے یہ ہمسفر نہ تھے
دو طنز تھے حیات پہ شام و سحر نہ تھے

آنسوؤں پر اس طرح ہنستے ہیں لوگ
جیسے غم کا کوئی مستقبل نہیں

میرے غم کو بھی سمجھ کر دیکھئے
مسکرا دینا بہت آسان ہے

مری زیست اک جنازہ ہے جو راہ وقت میں ہے
جو تھکیں گے دن کے کاندھے تو سپرد شام ہوگا

غم کا بیان ان لفظوں میں نہایت بلیغ متحرک اور آفاقی ہے جس نے زندگی کی بے رنگی کو غیر فانی بنا دیا ہے جس کا تسلسل حد نظر تک صبح و شام کے کاندھے بدلتا ہوا ابدیت کی منزلوں کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ شاید یہ جنازہ جو حیات غم کا ہے جو اسی وقت دفن ہو سکتا ہے جب کائنات کی عمر ختم ہو جائے۔

ان کی غزلوں میں ہر صفحے پر کوئی نہ کوئی شعر ایسا مل جاتا ہے جو ماضی کے کسی نہ کسی حادثے کی خبر دیتا ہے۔ غم جاناں کے حادثات ہوں یا غم دوراں کے واقعات' ان تمام مشاہدات نے بحیثیت مجموعی ان کی شاعری میں ایک ایسا احساس اور منقلب پس منظر پیدا کر دیا ہے جس نے نہ صرف دل و دماغ کی دنیا بدل دی ہے بلکہ حیات و کائنات کی حقیقت تبدیل کر کے رکھ دی ہے۔

یہی حادثات غم ہیں تو یہ ڈر ہے جینے والو!
کوئی دن میں زندگی کا کوئی اور نام ہوگا

اس نزاکت طبع کے باوجود وہ قنوطی اور یاس پسند نہیں بلکہ حیات غم کے اس

طویل سفر میں انہوں نے جو نقش قدم چھوڑے ہیں وہ رجائیت، حوصلہ مندی یقین کامل اور ایمان بالجبر کا پتہ دیتے ہیں اور یہ عناصر شعری ادب میں بڑی افادیت رکھتے ہیں۔
مثال ملاحظہ ہو ؎
میں کچھ اس طرح جیا ہوں کہ یقین ہو گیا ہے
مرے بعد زندگی کا بڑا احترام ہو گا

انسانوں کی زندگی ہو یا ادب و شاعری ان میں ایک طرح کی کائناتی مقصدیت خود کار فرما نظر آتی ہے۔ یہ مقصدیت انفرادی اور ارادی نہیں ہوا کرتی لیکن عصری رجحانات سے متاثر ہو کر نئے دور کے شعرا نے ایک خود ساختہ اور انفرادی مقصدیت کو اپنا لیا ہے جو شاعری میں ایک بڑے شاعر اور عظیم ادیب کے لئے "دیوارِ راہ" ہے اور "قطعیت" کی زبردست ٹھوکر ہے جس سے آگے کاروان شعر و سخن کو بڑھنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اردو میں بہت سے شعرا آج بھی ایسے ملیں گے جن کی شاعری کے پس منظر میں ایک کائناتی مقصدیت ہے جو شاعر کو ہر طرح کی طباعی اور رائے زنی اور اپنے فیصلے آپ کرنے کا آزاد موقع بہم پہنچاتی ہے ـــ وسیم کے یہاں بھی اس "عظیم مقصدیت" کی جھلک ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی خوبصورت غزل کے مقطع میں بھٹکی ہوئی زندگیوں کو اطمینان کی بشارت دی ہے ملاحظہ ہو ؎
سرِ رہگذر بھٹکنے پہ وسیم مطمئن ہوں
یہ سنا ہے جب سے منزل پہ سکون عام ہو گا

ان چند سطور میں اپنے خیالات کے تسلسل کو ختم کرتا ہوں۔ اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ جو لوگ وسیم کی غزلوں کو پڑھیں گے وہ اس سے کچھ زیادہ ہی پہلو پیدا کر سکیں گے ـــ میں ان دنوں کوئی طویل مضمون لکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا کیونکہ ایک ماہ سے سخت علیل ہوں اور ماہ جون کی گرمی نے میرے جسم ناتواں کو اور بھی گداختہ کر رکھا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ مجموعہ چھپ کر نئی نسل میں ایک نئے فانی کے استقبال کا شعور پیدا کرے۔

**نشور واحدی**

ناظر باغ ۔ کانپور
۶ جون ۱۹۷۷ء

# فانوس سے شمع تک

"اسپیرو" ہلدوانی۔
۲ر نومبر سنہ ۱۹۶۴ء

شام رات کی حدود میں داخل ہو رہی ہے اور میں چودھری ماہراج سنگھ کی رہائش گاہ "اسپیرو" پر بیٹھا "ایک شمع" اور "فانوس" کے درمیانی فاصلوں کی سراپا نگاری میں مصروف ہوں۔ موصوف ایک سن رسیدہ سرکاری افسر ہیں۔ مگر علم و ادب کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں یہ دراصل ان کی، مکرمی لیشپال دتہ۔ نعیم احمد خاں اور مودود صدیقی کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو یہ مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میری "پریشاں خاطری" کے ہاتھوں ان حضرات کو برابر ذہنی تکلیف پہونچتی رہی اور یہ کام گذشتہ تین سال سے ٹلتا رہا —— بہر حال مجھے اپنی کوتاہی کا احساس ہے۔
انگریزی کے ایک مشہور ناول نگار ٹامس ہارڈی نے ایک جگہ لکھا ہے۔

There are disappointments which wring us, and there are those which inflict a wound whose mark we bear to our graves. Such are so keen that no future gratification of the same desire can obliterate them. They become registered as a permanent loss of happiness.

میں نہیں کہہ سکتا کہ ہارڈی کی ان سطور کا میری زندگی سے کیا تعلق ہے۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ انھیں پڑھکر مجھے اکثر سکون ملا ہے۔ میری غزلیات قطعات اور نظمیات کا پہلا مجموعہ "تبسم غم" آپکے ہاتھ میں ہے ــــ ابتک اس زندگی میں جو کچھ جس طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے شعری پیکر دینے کی کوشش رہی ہے ــــ خبر نہیں اس کوشش میں کامیابی کہاں تک ہوئی ہے۔ یہ فیصلہ آپکو کرنا ہے۔

اتنا ہر صاحبِ نظر جانتا ہے کہ غزل کے مروجہ علائم کی محفل میں رہ کر اپنی بات کہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ میں نے ابتدا سے "اپنی بات" "اپنے انداز" میں کہنے کی کوشش کی ہے اور غزل کی مستقل علامتوں کے سہارے اشعار میں اپنے حساس وجود کو تحلیل کرتا رہا ہوں تاکہ یہ جتنا تہذیبی سرمایہ اپنے آغوش میں سمیٹے ہوئے ہیں اس تک اس دور کی نگاہیں پہونچیں۔ میں نے شعر کبھی اسلئے نہیں کہا کہ کسی جلوت کی زینت بنوں ــــ ہمیشہ اپنی تنہائیوں کا احترام کیا ہے اور سکونِ دل کے لئے شعر کہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ "اوراقِ پریشاں" گنتی میں بہت کم ہیں مگر ان میں جو کچھ بھی ہے اس کا تعلق زیادہ تر محسوسات سے ہے ــــ اس مجموعہ میں اکثر دو شعری و سہ شعری غزلیں بھی ملیں گی ــــ انھیں مکمل بھی کیا جا سکتا تھا اگر میں نے مجموعے کے حجم کے خیال سے اپنے آپکو شعر کہنے کے لئے نہ آمادہ پایا نہ مجبور کیا ــ میرے تمام کلام میں "آپ خود کلامی" کا انداز پائیں گے ــ جس کے پردے میں "میں" ملوں گا۔ مگر ماہرینِ نفسیات و عمرانیات کا خیال ہے کہ "میں" کبھی تنہا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس "میں" کی تخلیق میں خاندان، سماج، ماحول اور زندگی کے دیگر شعبے بھی مصروفِ کار رہتے ہیں۔ لہٰذا اتنا اور بڑھا لیجئے کہ اسکے پیچھے وہ زندگی بھی ہے جس نے اس "میں" کی پرورش میں حصہ لیا ہے۔

غزل کی علامتیں ہماری صدیوں پر پھیلی ہوئی تہذیب کی امانت دار ہیں ان علامتوں کی دسترس سے آج بھی اس "ہزار شیوہ" زندگی کا کوئی پہلو نہیں جو باہر ہو۔ صرف انھیں برتا سلیقے سے جائے تاکہ حیات وکائنات کی حقیقتوں تک نگاہ کسی لطیف حسن کے سہارے پہونچے ــــ اور عالمگیر حقائق کی بصیرت حاصل ہو۔ اگر میرے اشعار علائم کی رگوں میں دور تک پھیلی ہوئی تہذیبی ثقافتی تاریخ کو آگے بڑھانے کا فرض انجام دے سکے ہیں ــــ تو یہ میری خوش قسمتی ہے ــــ یہ فیصلہ بھی آپ کرینگے ــ

دسمبر ۱۹۶۲ء میں میری باقاعدہ شاعری کی عمر نو سال ہوتی ہے ویسے جہاں تک ذوقِ شعری کا تعلق ہے

میں نے بہت کم عمری میں کچھ مصرعے موزوں کر کے اپنے والد قبلہ نسیم مرادآبادی صاحب کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ ان دنوں مرتضیٰ اسکول رامپور میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا ـــــ انہیں کا ایک مصرع آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے ـــ ع "عجب کچھ کشمکش میں پڑ گئی ہے زندگی اپنی"

اسکے بعد عرصے تک اپنی تعلیمی مصروفیات کی بنا پر اس بارے میں کچھ سوچ بھی نہ سکا لیکن ۱۹۵۵ء میں "جنون حوادث" نے پھر انگڑائی لی یہ وہ زمانہ تھا جب بریلی کالج میں مجھے پہلی بار اپنے محترم پروفیسر تسنیم صدیقی و پروفیسر محمد عثمان قریشی کے بصیرت افروز لیکچروں کے ذریعہ علمی و ادبی نکتوں سے متعارف ہونے کا موقعہ ملا یہ وہ دن تھے جب آنکھ ہر حقیقت کو خوابوں کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ یہ تجدید شاید کبھی نہ ہوتی اگر مجھے مستقبل کی ان سنجیدہ شعری محفلوں میں شرکت کا موقع نہ ملا ہوتا جن کی روح رواں میرے استاد حضرت متقم حیدری تھے شعروادب کے علاوہ انسانیت و آدمیت کے بیشتر سبق میں نے موصوف سے سیکھے ہیں۔ یہاں جناب رفعت محمد خاں کی رہائش گاہ پر منعقد ہونیوالی اگران نشستہ ادبی محفلوں کا ذکر نہ کروں جن سے میں نے فن شعر کی نزاکتوں کو سمجھا اور سیکھا ـــــ تو میری ابتدائی شاعری کا خاکہ نامکمل رہ جائیگا ـــــ اصلاح سخن کا سلسلہ تقریباً تین سال جاری رہا اس کے کچھ عرصے بعد مجھے بسلسلۂ ملازمت سنبھل جانا پڑا جہاں کی پہلی رات آج بھی میری نظروں میں ہے۔ کتنا تنہا، کتنا اداس و مضمحل تھا میں ـــــ پہلی بار گھر چھوٹنے کا غم ـــــ دوست احباب اور ماحول سے بچھڑنے کا رنج ـــــ اور وہ بھی ایک جذباتی انسان کے لئے ـــــ بڑا صبر آزما تجربہ تھا ـــــ درحقیقت ـــــ سنبھل کے بارے میں لوگوں کی رائے کیا تھی اور میرے لئے یہ بستی کیا ثابت ہوئی اسکی تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے اگر ایک جملے میں کہوں تو میری بارنگ شاعری کا سنگ بنیاد سنبھل ہی میں رکھا گیا ـــــ لیکن اس پر بھی دلپذیر حسن پور کی ان ادب پرور نشستوں میں، اگرچہ جن کی سربراہی کا تاج نواب لطافت علی خاں اور جناب نعیم احمد خاں جیسی ادب دوست شخصیات تھیں ـــــ جنھوں نے میری شاعری کو اپنی زندگی کا سب سے اہم موضوع بنا لیا ـــــ اسے شعور فن کی انتہا سمجھنا چاہیئے ـــــ اگر میری زندگی کے سفر میں سنبھل و حسن پور کی راہ نہ آئی ہوتی تو شاید "تبسم غم" اس رنگ میں آپ تک نہ پہنچتا۔ ان بستیوں میں آج بھی قدیم تہذیب کے وہ عناصر موجود ہیں جن کی چھاؤں میں ایک تھکا ہوا حساس دل تھوڑی دیر دم لے سکتا ہے۔ یہاں کے بزرگوں نے مجھے پدرانہ شفقت، ہم مذاق دوستوں نے خلوص و پیار

اور حجولوں نے عزت دی۔ یہ سب کچھ میرا اور میری شاعری کے بہت کام آیا۔۔۔

مقدر کی تلون مزاجی نے سنبھل سے دہلی پہونچا دیا۔۔۔ جہاں خلوص کی کمی زندگی کا سطحیت دکھوکھلے پن نے یہاں تک مجروح کیا کہ میں اپنے آپکو اتنے بڑے شہر میں تنہا محسوس کرنے لگا۔۔۔ میرا وجود شہر کی تمام نزہتگاہ پروری کے باوجود اپنی ہی سانسوں کی آنچ میں پگھلتا رہا۔۔۔ یہاں اتنی فرصت کہاں کہ بقول Keats ۔۔۔

"Where men sit and hear each other groan"

ملازمت کا سلسلہ دہلی سے بریلی لے آیا۔۔۔ مگر وہی ہوا کہ ۔۔۔ ع

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی

اسے میری فطرت و قسمت دونوں کی سازش سمجھئے ۔۔۔ بریلی میرا شہر ہے یہاں کی فضاؤں میں سمٹکر ماضی وحال کے فاصلے تنے ہوئے ہیں ۔۔۔ یہاں کے گلی کوچوں میں میرا بچپن جوانی کو سونپا ہے ۔۔۔ یہیں میں نے کچھ کھویا ہے کچھ پایا ہے ۔۔۔ مگر اس تلخ حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اس تاریخی بستی کے ہونٹ آج بھی ایک مخصوص ادبی تکلم کو ترستے ہیں ۔۔۔ یہاں کتنے ہی چراغ جلے اور اپنے ماحول کی "بادِ عدم توجہی" کی گود میں ہمیشہ کے لئے سو گئے ۔۔۔ یہ معمولی المیہ نہیں ۔۔۔ گذشتہ ۲½ سالہ دوران قیام میں قبلہ نواب کبیر حسن خانصاحب کی حوصلہ افزا قدردانی، فن 'استادِ محترم پروفیسر محمد عثمان قریشی کی ہرگام علمی وادبی رہنمائی۔ محترم مقتم حیدری کی پُر خلوص ہمدردی اور اختر نظامی و رئیس صدیقی جیسے باشعور دوستوں کی نکتہ دانی نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو یہ شہر خموشاں میری شمع فکر کو بھی نہ جانے کونسے "گوشۂ بے آواز" کی زینت بنا چکا ہوتا ۔۔۔

میری زندگی کا اجمالی خاکہ آپکے سامنے ہے ۔۔۔ ایک زندگی اس کے علاوہ بھی ہے ۔۔۔ جسے آسانی کے لئے "زندگی پس پردہ" کہا جا سکتا ہے۔ اور جس کا ذکر کئے بغیر "زندگی بیرونِ پردہ"

کے تمام خاکے غیر واضح رہتے ہیں ـــــ مگر ابھی ہمارا سماج اتنا ترقی یافتہ نہیں کہ بعض موضوعات کی نقاب کشائی کو برداشت کر سکے۔ لہٰذا یہ کام، اگر واقعی زمانے کو اس کی ضرورت ہو، مستقبل کے کسی سوانح نگار پر چھوڑا جاتا ہے ـــــ

شاید پہلے بھی کہہ آیا ہوں کہ گذشتہ چند سال سے ایک رنگ کی پرورش کر رہا ہوں ـــ جس کا میری اپنی سمجھی کی زندگی سے تعلق ہے۔ بعض لوگوں کو ممکن ہے یہ رنگ پسند نہ آئے ـــ اُن کی ناپسندیگی سے اگر زندگی کی ظالم حقیقتیں بدل جائیں۔ تو ممکن ہے مجھے بھی کچھ اس ضمن میں سوچنا پڑے ـــ ورنہ میرے اوپر کوئی اثر نہیں پڑتا ـــ میں نے زندگی کو جس طرح دیکھا ہے پیش کر دیا ہے ـــ اگر ان اشعار کے مطالعے سے کسی کے جذبات مُردہ ہوتے ہیں یا یاس و ناامیدی کا احساس بڑھتا ہے تو یہ اس کی اپنی کمزوری ہے ـــ کیونکہ اسٹیج پر بھی "خون آلود" منظر پیش کرنیکا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ دیکھنے والا اپنا بھی خون کر لے ـــ میرے خیال میں تو حادثات کے تیر سینے پر لینے کے لئے بڑے عزم و استقلال و تحمل کی ضرورت ہے ـــ اینڈ القنوطی بزدلوں کا شعار نہیں، غم سے لذّت وہی لے سکتا ہے جو لذّات دنیوی کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو کر انھیں ہیچ سمجھے ـــ اور یہ ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ـــ فن کار کا فرض معاشرے کا بہتر تصور پیش کرنا نہیں ـــ یہ کام ہے سیاست والوں کا جو عوام کو سبز باغ دکھا کر بدلے میں کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ فن کار تو جو دیکھے اور محسوس کرے وہ دوسروں کو دکھائے اور محسوس کرائے، زندگی کے متضاد پہلوؤں کے تصادم سے حقیقتوں کو اُبھارے اور صداقتوں کے حُسن کو نکھارے، یہی اُس کا فرض ہے یہی اُس کا فن ـــ اگر ایسا نہیں کرتا تو وہ اپنے مستقبل سے بے خبر ہے ـــ

وسیم بریلوی
شعبہ اُردو۔ بریلی کالج
بریلی۔ (یو۔پی)۔

خوب سمجھے حیات کا مفہوم
لبِ تبسّم سے ہو گئے محروم

اجنبی دِل میں مُسکراتا رہا
تیرا غم بھی ہے کس قدر معصوم

فیصلہ حُسن و عشق کا نہ ہوا
کون ظالم ہے کون ہے مظلوم

ہنس رہا ہوں کہ لوگ ہنستے ہیں
دِل کی حالت کسی کو کیا معلوم

حُسن سب ناز عشق سارا نیاز
پھر بھی دونوں ہیں لازم و ملزوم

تیری دُنیا میں آکے بھُول گیا
زندگی کا بھی تھا کوئی مفہوم

کون ہے میکدے میں میرے سوا
التفات و شراب سے محروم

شعر و آنسُو میں فرق کیا ہے وسیمؔ
دونوں رکھتے ہیں اک غمِ منظوم

آنکھ میں آنسو ہیں رونے کی تمنّا دِل میں ہے
اک قدم منزل سے باہر اک قدم منزل میں ہے

ضبطِ غم سے مٹ گئی آخر جوانی کی اُمنگ
پہلے دِل مشکل میں تھا اب زندگی مشکل میں ہے

عالمِ عشق و وفا سے آ رہی ہے یہ خبر
راہ میں تاریکیاں ہیں روشنی منزل میں ہے

شمعِ محفل جل اُٹھی اور جل گیا پروانہ بھی
دیکھنا یہ ہے اُجالا کس کے مستقبل میں ہے

دلِ مغموم کیسا رونا ہے

کونسا گھر تجھے ڈبونا ہے

مسکراؤ ہمارے رونے پر

آج غم میں خوشی سمونا ہے

صبح گلشن سے کتنی دور ہیں وہ

جن کی صحرا میں شام ہونا ہے

بجلیوں پھونک دو نشیمن کو

ہو ہی جائے جو بات ہونا ہے

زندگی ہے تو زندگی کے لئے

زندگی بھر وسیم رونا ہے

اشک آنکھوں میں آگئے ہیں وسیم

آج افشائے راز ہونا ہے

ڈبو رہا ہے کہاں دردِ عاشقی مجھکو

بہت قریب سے تکتی ہے زندگی مجھکو

بس ایک بار ہنسا تھا ملا کے اُن سے نظر

پھر اُس کے بعد نہ آئی کبھی ہنسی مجھکو

کرم کیا جو مٹا کر دِل میں مسکرائے تم

بہت دِلوں سے خوشی کی تلاش تھی مجھکو

بدل دیا ہے تبسم کو چند اشکوں میں

بہت عزیز ہے دُنیا! تری خوشی مجھکو

وسیم ان کو بھلا تو دیا ہے دِل سے مگر

وہ یاد آتے ہیں اب بھی کبھی کبھی مجھ کو

شام ہوتی ہے منزلِ ابھی دور ہے
جانے کیا آج قسمت کو منظور ہے

ضبطِ غم کی فضا نے دکھایا یہ دِن
موت نزدیک ہے زندگی دور ہے

خود بدلنے سے فطرت بدلتی نہیں
ہنس رہا ہوں مگر قلب رنجور ہے

چھین لیتا ہے ہونٹوں پہ آئی ہنسی
کیا زمانے! یہی تیرا دستور ہے

اِن پریشانیوں میں وسیم آپ کو
بھول جاتا مگر دِل سے مجبور ہے

۲۲

خوشیوں سے اُترتے ہیں جب سینے میں غم پہلے
احساس کی منزل پر جمتے ہیں قدم پہلے

کوتاہی رہبر سے منزل نہ ملی ورنہ
دل بعد میں ڈوبا ہے بہکے تھے قدم پہلے

آساں نہیں سورج کی دُنیا میں پہونچ جانا
شبنم نے بھی رکھے تھے شعلوں پہ قدم پہلے

ساقی کی نگاہیں تو کچھ دیر میں بدلیں گی
اُٹھ کر چلے آئیں گے میخانے سے ہم پہلے

اُلفت میں وسیم آخر ٹھہری ہے وہی منزل
گذرے تھے بہت بچکر جس راہ سے ہم پہلے

تمہاری راہ میں ہم زندگی گذار چلے
قرار ڈھونڈھنے آئے تھے بیقرار چلے

بہار خندۂ تبسم تھا جن کی فطرت میں
ترے چمن سے وہ غنچے بھی اشکبار چلے

ترے خیال میں یوں زندگی گذرتی ہے
کہ جیسے گود میں لیکر کوئی بہار چلے

وسیم ایسے زمانے میں اس مزاج کے ساتھ
یہ کم نہیں ہے کہ ہم زندگی گذار چلے

نغمۂ غم سے بھی کام چل جائے گا

دِل بہر حال دِل ہے بہل جائے گا

آنکھ لگنے نہ پائے کہیں راہ میں

پھر زمانہ کوئی چال چل جائے گا

ایک ہی دھن میں نغمہ بھی اور آہ بھی

کیا نظام دو عالم بدل جائے گا

ساتھ چھوڑے وسیم اب نہ یہ بیخودی

ہوش آیا تو پھر دِل مچل جائے گا

دیکھئے دور بدلتا ہے کہ ساقی کی نظر

آج میخانے میں پروردۂ غم آئے ہیں

تم کہیں مری محبت سے گریزاں تو نہیں

وہم کیسے مرے دل میں شبِ غم آئے ہیں

نگۂ لطف کا اک جام اِدھر بھی ساقی

سب سے پہلے ترے میخانے میں ہم آئے ہیں

آنکھ لگنا بھی قیامت تھا جوانی میں وسیمؔ

ٹھوکریں کھائی ہیں تب ہوش میں ہم آئے ہیں

اس زمانے سے سفر کرتے اگر کر سکتے
موت سے پہلے ہی مر جاتے اگر مر سکتے

تم ہی اچھے کہ رہ و رسم سے ہے تم کو گریز
ہم سے تو پوچھو کہ ہم یہ بھی نہیں کر سکتے

کون تخیّل کی وادی میں ہے آہستہ خرام
رہ گئے چھا کے خیالات کے اُوپر سکتے

عزم مے نوشی اور اللہ رے یہ مجبوری
آپ میخانے سے اک جام نہیں بھر سکتے

ہم سے سمجھا نہ گیا ایک پتنگے کا مزاج
کاش ہم لوگ بھی جینے کے لئے مر سکتے

اک نگاہ کرم آغاز اِدھر بھی ساقی
زخم دِل جام نہیں ہیں کہ نہیں بھر سکتے

غم سے گھبرا کے یہ چاہا تھا کہ مر جائیں وسیم
جذبۂ عشق پکارا کہ نہیں مر سکتے

کب چشمِ الم ہوتی ہے نم دیکھ رہا ہوں

ہیں عشق میں خودداری غم دیکھ رہا ہوں

ان آنکھوں کو نم بعد ستم دیکھ رہا ہوں

یہ سازشیِ اندازِ کرم دیکھ رہا ہوں

آئینۂ طوفان الم دیکھ رہا ہوں

کتنا مرے سینے میں ہے دم دیکھ رہا ہوں

یہ راہِ صنم خانہ ہے وہ راہ حرم ہے

کس راہ پہ اُٹھتے ہیں قدم دیکھ رہا ہوں

مَیں گردشِ دوراں کو سمجھنے کے لئے آج

اُلجھا کے تری زلف کے خم دیکھ رہا ہوں

اللہ کے بندوں پہ وہ ستم آج یہ دن ہے

اللہ کے بندوں کا ستم دیکھ رہا ہوں

مصلحت بھی اگر دل کی آگ کم ہوگی
تو اک طرح سے یہ توہینِ رسمِ غم ہوگی

زمانے! راہ میں چھوڑے تو جا رہا ہے مجھے
مری کمی تجھے محسوس ہر قدم ہوگی

بسی ہوئی ہے مری غم نواز نظروں میں
وہ رات جس میں چراغوں کی عمر کم ہوگی

میں سوچتا ہوں کہ محرومیوں کی راہوں میں
ترے کرم کی تمنا نیا قدم ہوگی

تری نگاہِ کرم کو سمجھ کے کیا ہوگا
کہ اس سے اور مرے غم کی عمر کم ہوگی

ملے تھے ہوش کے عالم میں آج ہم کو وسیم
شراب خانے میں شاید شراب کم ہوگی

وسیم کون سُنے گا ترا فسانۂ غم
تری خوشی کے لئے کس کی آنکھ نم ہوگی

مٹے وہ دِل جو ترے غم کو لیکے چل نہ سکے
وہی چراغ بجھائے گئے جو جل نہ سکے

ہم اس لئے نئی دُنیا کے ساتھ چل نہ سکے
کہ جیسے رنگ یہ بدلی ہے ہم بدل نہ سکے

مَیں ان چراغوں کی عمرِ وفا کو روتا ہوں
جو ایک شب بھی مرے دِل کے ساتھ جل نہ سکے

خدا کرے مجھے پیتے ہے روکنے والے
زیادہ دیر ترا دورِ جام چل نہ سکے

میں وہ مسافرِ غمگیں ہوں جس کے ساتھ نسیم
خزاں کے دور بھی کچھ دور چل کے چل نہ سکے

وسیم اہلِ جہاں نے زباں قلم کر دی
مرے خیال پہ جب اُن کے زور چل نہ سکے

ستم کے بعد اگر دعوتِ کرم نہ ملے
تو دل بھی سوچتے اس درجہ محوِ غم نہ ملے

اسی خیال سے پلکوں پہ رک گئے آنسو
تری نگاہ کو شائد ثبوتِ غم نہ ملے

ہر ایک گام پہ خاروں نے پیش گامی کی
رہِ وفا میں مسافر نواز کم نہ ملے

خوشی کا دور بھی رو کر گذارنے والے
خدا کرے کہ تجھے انتہائے غم نہ ملے

نہ ٹوٹے سلسلۂ دورِ جام اے ساقی
یہ رات اس طرح گذرے کہ غم کو دم نہ ملے

اگر مقامِ محبت کو لوگ پہچانیں
تو بتکدے کے مقابل کہیں حرم نہ ملے

تبسم بعد ترے سوچ رہے ہیں وہ بھی
ہمارے دور کا شاعر تھا اس سے ہم نہ ملے

وسیم جی چکے مرنے کا اہتمام کریں
بہت چلا یہ فسانہ چلو تمام کریں
وہ غم دیئے کہ جنھیں ہنس کے پی لیا ہم نے
وہ غم بھی دے کہ جنھیں رو کے نذرِ جام کریں
رہ حیات ابھی تو ادھر سے گذریگے
وہ قافلے کہ جنھیں منزلیں سلام کریں
وہ جانتے ہیں کہ اہلِ وفا بہت کم ہیں
ستم کی رسم زمانے میں کیسے عام کریں
اے اجل بھی پیام حیات گذریگی
وہ زندگی کہ جسے حادثے تمام کریں

وسیم بہنے دو اشکوں کو ان کی مرضی پہ
یہ غم کے قافلے جانے کہاں قیام کریں

غم میں یوں ڈوبے ہوئے ہم تری محفل سے چلے

جیسے اک راہ کسی پیار کی منزل سے چلے

اب وہ منزل ہے ترے درد کی اے درد نواز

دِل بھی سینے سے چلے درد اگر دِل سے چلے

اہلِ منزل میں شمار اُن کا ہے اے آزادی

دو قدم بھی جو تری راہ میں مشکل سے چلے

ہائے وہ اُن سے سرِ راہ مُلاقات وسیم

بعد جس کے جُھجک کر بڑی مشکل سے چلے

لُوٹا جاتا ہے ہر اک قافلہ منزل کے قریب
جب یہ عالم ہے تو پھر عزمِ سفر کون کرے

ہم نے بُجھتے ہوئے دیکھے ہیں اُمیدوں کے چراغ
ان ستاروں کی اداؤں پہ نظر کون کرے

جس سے اپنے ہی مُقدّر کے اندھیرے نہ مٹے
اس شبِ غم سے تمنائے سحر کون کرے

اشک پی لیتا ہوں یہ سوچ کے دانستہ وسیم
دل کے ٹکڑے ہیں انھیں چشم بہ در کون کرے

چمن سے رو کے نہ یونہی سحر گئی ہوگی
چھری بہار کے دل میں اُتر گئی ہوگی

خلاف وضع مرا حال پوچھنے والے
تری نگاہ بھی انجام پر گئی ہوگی

شراب پی ہے تو آنکھوں میں آج اشک نہیں
شراب سینۂ غم میں اُتر گئی ہوگی

وسیم سُن لئے دُنیا نے میرے شعر مگر
جگر کے زخموں پہ کِس کی نظر گئی ہوگی۔

شام آئی آنکھ میں اشک آگئے
کیا تصرف تھا دیئے شرما گئے

کتنی محکم تھی خزاں کی دسترس
خود کھلے تھے پھول خود مرجھا گئے

اس قدر مانوس تاریکی سے تھے ہم
روشنی پھیلی تو خود گھبرا گئے

رحمتیں بھی تھیں گناہوں کی شریک
جام اُٹھایا تھا کہ بادل چھا گئے

کتنی ہی خودداریوں کا خون تھا
مرنے والے کو پسینے آگئے

منزلیں اب محوِ استقبال ہیں
ہم ترے نقشِ قدم تک آگئے

کیا یہی دورِ ترقی ہے نسیمؔ
ہر اُجالے پر اندھیرے چھا گئے

تری بزم تک تو آ دیں جو یہ آ نا راس آئے
یہ سُنا ہے جو گئے ہیں وہ بہت اُداس آئے

مجھے مستقل جُدائی میں اب اک سکون سا ہے
وہی مطمئن نہیں ہیں جو تمہارے پاس آئے

میں شراب پی رہا ہوں مرے پاس کیسی فر صت
کسی اور وقت غم سے کہو میرے پاس آئے

کبھی اے وسیم پہونچے جو غموں میں مُسکرانے
اُٹھا شور میکدے میں کہ وہ دیوداس آئے

وہ دل آپ مٹ رہیں گے ترا غم اُٹھا نہ جن سے
وہ چراغ کیا جلیں گے جنھیں شب نہ راس آئے

تیری محفل میں لوگوں کے چہرے پہ کیوں میرے اُٹھنے سے پہلے اُترنے لگے
کیا یہ اپنے کیے پہ پشیماں ہوئے یا مری بیگناہی سے ڈرنے لگے

میری ناکامیاں اک الگ چیز ہیں عشق کا مجھ پہ یوں بھی تو احسان ہے
کیا یہ کم ہے کسی خانہ برباد کی زندگی تیرے غم میں گذرنے لگے

ایک شاعر نے دل میں جلایا جنھیں اب وہ معصوم غم کے دیے بجھ چلے
آپکے ذکر کا اک ذریعہ تو تھا ہائے یہ کیا ہوا زخم بھرنے لگے

اب محبّت کے انجام کو سوچنا میرے ٹوٹے ہوئے دل کی توہین ہے
تم نے اچھا کیا میری بربادیاں دیکھ کر اس زمانے سے ڈرنے لگے

ختم ہے زندگی کا سفر اے وسیم آگئی مری منزل قریب آگئی
دم اُلجھنے لگا دل ٹھہرنے لگا چلتے چلتے مرے پاؤں بھرنے لگے

کب دِل مرا اُداس نہیں آنکھ تر نہیں
یہ میرا ظرف ہے کہ تمہیں کچھ خبر نہیں

یہ ابتدائے شب یہ لرزتی ہوئی سی لو
اے شمع! کیا تجھے بھی اُمید سحر نہیں

اے موت! بے قرار نہ ہو صبح دور ہے
اب رات زندگی سے مری مختصر نہیں!

راہوں کی زندگی میں بلا کا سکون ہے
راہی کی طرح ان کو کہیں کا سفر نہیں

اللہ رے احتیاط تری رہگذار میں
یوں جا رہا ہوں جیسے کہیں کا سفر نہیں

غم اور ہو گا سُن کے نہ آئے اگر وسیمؔ
اچھا ہے میرے حال کی ان کو خبر نہیں

داغ آنسوؤں سے دل کے کیا کیا کہ دھو دیئے
منزل کے اپنی آپ نشاں ہم نے کھو دیئے

وہ کیا کریں گے میرے شبستاں میں روشنی
بجھ جائیں آندھیوں کے تصوّر سے جو دیئے

ہم غم نواز آپ کی محفل کو کیا کہیں
ہنستے ہوئے جو لوگ گئے تھے وہ رو دیئے

مالک نے تو کرائی فرشتوں سے بندگی
اپنے مقام آپ ہی انساں نے کھو دیئے

تھی راہِ شب تو بزم میں روشن تھا ایک ایک
تھے منزلِ سحر پہ مگر ایک دو دیئے

رومانیت کے سائے میں اُبھرے تھے جو نسیم
تم نے وہ شعر خونِ جگر میں ڈبو دیئے

غموں پہ ہم ہی اگر یوں نہ التفات کریں

یہ بے گناہ کہاں جائیں کس سے بات کریں

ہمیں قبول ہے الزام ترکِ گفت و شنید

ترے خیال کو چھوڑیں تو تجھ سے بات کریں

میں جا رہا ہوں زمانے کو چھوڑ کر لیکن

عجب نہیں کہ مرا ذکر حادثات کریں

گذر چکی ہے کہ جو آجکل گذرتی ہے

تمہیں بتاؤ کہ کس زندگی کی بات کریں

گلے میں ڈال کے باہیں غزل یہ کہتی ہے

چلو نسیم کہیں چل کے دل کی بات کریں

شب میخانہ بھی جب تجھ پہ گراں گذریگی

زندگی! تو ہی بتا دے کہ کہاں گذرے گی

تو نے اک بزم کو روشن تو کیا ہے لیکن

عمر اے شمع! تری بن کے دھواں گذریگی

زندگی! تیرے لئے میں نے بہت کچھ کھویا

یہ نہ سمجھا تھا کہ بے نام و نشاں گذرے گی

آج پی لینے دے ساقی مجھے جی لینے دے

کل مری رات خدا جانے کہاں گذرے گی

اُن سے کہدو مجھے خاموش ہی رہنے دیں وسیم

لب پہ آئے گی تو ہر بات گراں گذریگی

کوئی نکلے ایسا سورج جو یہ رات لے کے جائے
کوئی ایسا غم بھی دیدے جو حیات لے کے جائے

---

آنکھوں میں اشک ہاتھ میں جام شراب ہے
دنیا ترے ستم کا یہی اک جواب ہے

---

سکوں بقدر ضرورت جسے نصیب ہا نہیں
عجیب آپ کے غم ہیں وہ دل عجیب ہا نہیں

میرے سامنے آ کے شبنم چھپاتے ہو
پھر کس لئے چھپ چھپ کے میرا غم اٹھاتے ہو
آفتاب غم سے پہلے صبح آتی ہے
تم کو کیا خبر ستارو! تم ڈوب جاتے ہو

بادِ ستم کا یوں تو ارادہ ہی اور ہے
میں نے مگر چراغ جلایا ہی اور ہے

آنکھوں میں اب کہاں وہ نشے کی سی کیفیت
تم سے جدا ہوئے ہیں تو دنیا ہی اور ہے

زندہ جو رہنے دیں تو اٹھاتا رہوں یہ غم
لیکن وسیم ان کا ارادہ ہی اور ہے۔

یہ سوچ کے ہم سے نہ پہلے آنکھوں میں ہم ہی اشک آئے ہیں
میں جا تو رہا ہوں دنیا سے اب کیسے یہ غم رہ جائیں گے
سوچا بھی نہ تھا جن راہوں کو پیچھا یہ ہم سے منزل تک
خود بن گئے انھیں راہوں میں کبھی اک نقش قدم رہ جائیں گے

حیات انھیں ملی جن کو غمِ حیات نہیں
وہاں چراغ جلے ہیں جہاں پہ رات نہیں
اندھیرے جس کا مقدر نہ ہوں وہ رات نہیں
اُداس میں نہ رہوں میرے بس کی بات نہیں
تمہاری بزم میں اُن کے بھی جام خالی ہیں
جنھیں یقیں ہے کہ محروم التفات نہیں
تمہارا ذکر ہے دُنیا کو کیوں تردّد ہے
مرے لبوں پہ کسی اور کی تو بات نہیں
پلا اور اتنی کہ ایماں ڈگمگا جائے
ترا وسیم اسیرِ غمِ نجات نہیں
حیات جس کے لئے ہو اسے تردّد ہو
وسیم مرے لئے گردشِ حیات نہیں
وسیم جانب منزل قدم اُٹھائے چلو
حیات راہ میں کام آئے کوئی بات نہیں

دل ہیں اشکوں کی اب نشانی سے
جل رہے ہیں چراغ پانی سے

اک انوکھا سوال خود بنکر
جا رہا ہوں دیارِ فانی سے

رو کے شب کاٹتی ہے جلتی ہے
شمع خود اپنی زندگانی سے

اب جفائیں تری پشیماں ہیں
میری غم کی مزاج دانی سے

موت کی آرزو سے کیا ہوگا
موت خالی ہے زندگانی سے؟

مسکرانے کو دل نہیں کرتا
اہلِ دُنیا کی مہربانی سے

اس جہاں میں وسیم نکلی ہے
ہر کہانی مری کہانی سے

میری یہ فکر کہ منزل سے ادھر شام نہ ہو
اس لئے ہے کہ تری راہبری بدنام نہ ہو
ایک ساغر کے سہارے سے جو گذاری ہیں نے
زندگی ایسی کسی چیز کا اک نام نہ ہو
آ گیا ہوں تری محفل میں مگر ڈرتا ہوں
ان چراغوں کا سا میرا بھی انجام نہ ہو

بجھے ہوئے دل کی بھی زباں باز نہیں ہے
اک شمع بھڑکتی ہے اور آواز نہیں ہے
چھنگر اب تو کوئی راز نہیں ہے
قصّے کا اب انجام ہے آغاز نہیں ہے
آؤ یہ محبت ہے اسے دونوں نبھائیں
اک دل میں سما جائے یہ وہ راز نہیں ہے

یہ بزم ہے وسیم اسی رات رات کی
لو تمہاری ہی ہے چراغ حیات کی

---

اے گردش حیات مرا ساتھ چھوڑ دے
کب تک چلے گی ساتھ مرا ساتھ چھوڑ دے

---

تم نے اچھا کیا آنسو دیئے آنکھوں کے لئے
میری راتوں کو چراغوں کی ضرورت نہ رہی

یہ میرا ظرف ہے کہ بقدرِ غمِ حیات
اشک آنکھ میں رہے تو نمایاں نہیں ہے

ہر چند ہم نے رو کے گزاری مگر وسیم
اس زندگی سے پھر بھی گریزاں نہیں ہے

۵۰

ترے نہ ہونے سے یوں سوگوار گذری ہے
بہار جیسے شبِ انتظار گذری ہے

وہ شمع کیسے بتائے گی منزلوں کے نشاں
حیات جس کی سرِ رہگذار گذری ہے

مجھے حیات کی مجبوریاں نظر آئیں
نظر سے جب کوئی لوحِ مزار گذری ہے

ستارے ڈوب رہے ہیں و داعیاں دیکر
نہ جانے کس کی شبِ انتظار گذری ہے

دلِ وسیم سے ہر شام انتظار کے بعد
بہت اداس امیدِ قرار گذری ہے

صورتِ بزم کچھ ایسی ترے جاتے ہی بنی
تیرے دیوانوں کو ہر شمع بجھاتے ہی بنی

آگ کو آگ کے شعلوں میں بجھاتے ہی بنی
دل میں جب درد اُٹھا جام اُٹھاتے ہی بنی

ہائے ان مدھ بھری آنکھوں کی نشیلی گردش
قیمتِ جام نگاہوں سے گراتے ہی بنی

نہ سوچ کر کبھی انجام گم رہی میں نے

اس ایک عمر میں تیری تلاش کی میں نے

خوشی کی دھوپ میں تلخی تھی اسلئے اے دوست

حیات سایۂ غم میں گذار دی میں نے

تمام رات بتری آنکھ کا خیال بخیر

لبوں سے جام لگا کر گذار دی میں نے

مری اُداس نگاہی وسیم کافی تھی

ثبوتِ غم کے لئے آنکھ تر نہ کی میں نے

اسے اشک بہہ رہے ہیں کہ چراغ جل رہے ہیں
اسے بعد راہ غم میں کبھی روشنی نہ ہوگی

---

تم دور کشاکش کی اس بے پایاں کیا جانو
تم دور سے گزرے ہو اور ہم نے گزارا ہے

---

وہ غم عطا کیا دل دیوانہ جل گیا
ایسی بھی کیا شراب کہ پیمانہ جل گیا

اُداس وحشتیں تکتی تھیں بام و در سے مجھے
بلا رہا ہے ذوقِ بیاباں خود اپنے گھر سے مجھے

یہ سوچ کر مری پلکوں سے اشک گر نہ سکے
کہ تیرا غم نہ گرا دے کہیں نظر سے مجھے

تمہاری یاد تصوّر کا ساتھ دیتی ہے
تو منزلیں نظر آتی ہیں رہگذر سے مجھے

یہ نامرادیٔ منزل گراں نہیں گذری
وہ تجربات ملے ہیں ہر اک سفر سے مجھے

یوں لگے راہ کو تیری جو کبھی ہم گزرے
جیسے اک ہنستے ہوئے دل سے کوئی غم گزرے

اتنا مانوس ہوں بڑھتی ہوئی تاریکی سے
یہ تمنا بھی نہیں ہے کہ شبِ غم گزرے

ہر ایک اشک ہے تیرے، تری خوشی کے لئے
میں رو رہا ہوں ترے غم کی زندگی کے لئے
یہ کیسی رات ہے جس میں ہمارا ذکر ہی کیا
ترس رہے ہیں ستارے بھی روشنی کے لئے
میں مسکرا اٹھیں کیا مانگتا مگر اے دوست
کچھ آنسو تو ضروری ہیں زندگی کے لئے
کس اہتمام سے گذری ہے زندگی میری
نہ کوئی میرے لئے تھا نہ میں کسی کے لئے
کسی کو مرگِ مسلسل میں جو ملے ہونگے
وہ لطف میں نے وسیم اس جہاں میں جی کے لئے

اُٹھایا جام تو ساقی نے گل کئے وہ چراغ
جو پینے والوں سے جلکر سحر کا ذکر کریں

---

نئے دَوَر کے چراغو! تمہیں کتنی حسرتوں سے
وہ مکاں تک رہے ہیں جہاں روشنی نہ پہنچی

---

روشنی سے ہیں دامن بچائے
کتنے خود دار ہوتے ہیں سائے

وہ سہما سہما تبسم اُن کا شمیم پہ چشمِ کرم اُٹھا کر
کہ جیسے کوئی ٹھہر رہا ہو سفر میں پہلا قدم اُٹھا کر

خدا ترے غم کو زندگی دے کہ جس نے تنہا چھوڑا ورنہ
ہر ایک غم پہ میں سوچتا تھا کہ کیا کروں گا یہ غم اُٹھا کر

عجب نہیں یہ اُجالا دیکھ کر اندھیرا منزل پہ میری کر لیں
مری رہ آرزو سے لے جا چراغ دیر و حرم اُٹھا کر

جہاں میں رہنے کی ایسی قیمت مرے علاوہ کوئی نہ دیگا
یہ وضع داری ہے میرے دم تک کہ سر اُٹھاتا ہوں غم اُٹھا کر

مرے ان اشکوں کو کون دیکھے گا کس کا دامن اِدھر بڑھیگا
شمیم رونے دو سر جھکائے کروں گا کیا چشمِ نم اُٹھا کر

ابھی بیٹھے بیٹھے میں تھک گیا تھا کہ تیری یاد میں ڈوب کر ذرا سر کو میں نے جھکا لیا
مرے سامنے سے یہ سوچ کر کہ مرے حواس چلے گئے مرا جام کس نے اٹھا لیا؟

نہ حیات رہتی بہار کی نہ بہار رہتی حیات کی بڑی خوفناک یہ رات تھی
تری نیند اُڑانے کے واسطے یہ مرا ہی ظرف تھا باغباں کہ نشیمن اپنا جلا لیا

اسی دل کو اب جو ٹھہر گیا تھا تری جدائی کے بعد بھی ترا ذکر کر کے رُلا دیا
یہ قصور مجھ سے بھی ہو گیا کہ جو شمع تو نے بجھائی تھی اسے میں نے پھر سے جلا لیا

کوئی غم رہا نہ غم خوشی نہ غم حیات کی بےلبی بڑھے عمر اور شراب کی
غم زندگی کو بھی پی گئے کسی میکدے میں جب آ گئے جہاں جام منہ سے لگا لیا

میری شاعری میں حبیب ہے مری بےکسی میں بھی بات ہے مری منزلیں بھی سجھ گئی
میں وہی وسیم ہوں زندگی جسے تیرے دور نے کھو دیا جسے تیرے در نے پا لیا

وہ دل جو تیرے لئے مستقل اُداس نہیں
اک ایسا جسم ہے جس پر کوئی لباس نہیں
کسی حسین کا دامن ہو جس کی قسمت میں
وسیم ایسا اک آنسو بھی میرے پاس نہیں

روشنی اندھیروں کے دل میں پلتی رہتی ہے
ہائے کیسی راتوں میں شمع جلتی رہتی ہے

---

زندگی تو ہی مجھے ایسی منازل سے گزار
کہ مری موت کا مجھ پر کوئی احساس نہ رہے

---

میں پی رہا ہوں کہ پینا انھیں عذاب نہیں
یہ میرے اشک ہیں ساقی تری شراب نہیں

اشکوں کا اک تار بندھا کچھ دیر رہا اور ٹوٹ گیا
ہائے کسی کے غم کا دامن ہاتھ میں آ کر چھوٹ گیا

منزل تو راہیں از خود پیدا ہوتی جاتی ہیں
کون سہارا دے گا مجھے جب تیرا سہارا چھوٹ گیا

سمٹ کر رہ گیا

صرف تیرا نام سمٹ کر رہ گیا
آج دیوانہ بہت کچھ کہہ گیا
کیا میری تقدیر میں منزل نہیں
فاصلہ کیوں مسکرا کر رہ گیا
زندگی دنیا میں ایسا اشک تھی
جو ذرا پلکوں پہ ٹھہرا بہہ گیا
اور کیا تھا ان کی پرسش کا جواب
اپنے ہی آنسو چھپا کر رہ گیا
اس سے پوچھ لے کامیاب زندگی
جس کا افسانہ ادھورا رہ گیا
ہائے کیا دیوانگی تھی اے وسیم
جو نہ کہنا چاہیئے تھا کہہ گیا

لب پہ دل کی بات بھی آئی نہیں

کیا یہ تیرے غم کی رسوائی نہیں

گھیر لیتے ہیں زمانے کے خیال

میری تنہائی بھی تنہائی نہیں

آنکھ سے آنسو بہا کر کیا کروں

میں ترے غم کا تماشائی نہیں

مسکرانا چھوڑ دے اے زندگی

یہ ادا کلیوں کو راس آئی نہیں

راستوں میں ہو گیا ہر تجربہ

اب میں منزل کا تمنائی نہیں

ان دنوں میں تو بہت مجبور تھا

کیا تمہیں بھی میری یاد آئی نہیں

میری خاموشی کو سمجھے تو کوئی

اتنی شعروں میں بھی گہرائی نہیں

اے وسیم آنکھیں تمہاری سرخ ہیں

رات بھی لگتا ہے نیند آئی نہیں

مرے دل کی غم پسندی تو ضرور کم نہ ہوگی
مگر اُن کی آرزو ہے تو اب آنکھ نم نہ ہوگی
مری آنکھ سے کچھ آنسو جو بہیں تو غم نہ کیجئے
یہ شراب اپنے ساغر سے چھلک کے کم نہ ہوگی
مری موت پر کچھ ایسے یہ چراغ گل ہوئے ہیں
مرے بعد جیسے دُنیا میں یہ شامِ غم نہ ہوگی
کسی میکدے میں جاؤں کہ حرم میں شب گذاروں
مگر ایسی تشنگی ہے جو وسیم کم نہ ہوگی

زندگی ہے اور دلِ نادان ہے
کیا سفر ہے اور کیا سامان ہے
میکدہ غم کو بھی سمجھ کر دیکھئے
مسکرا دینا بہت آسان ہے
میں نے رو رو کر گذارا ہے تجھے
زندگی تجھ پر مرا احسان ہے
لوگ دیوانہ بتاتے ہیں جسے
دیکھنا شاید کوئی انسان ہے
موت کو یوں یاد کرتے ہو وسیم
جیسے مر جانا بہت آسان ہے
خوں پلانے کے لئے ہو تو وسیم
شاعری تنہائیوں کی جان ہے

اندھیرے صرف اندھیرے نظر کدھر جائے
یہ شب بھی یاد رہے گی اگر گذر جائے
خدا کرے یہ کبھی میرے حال پر جائے
تری نظر پہ بھی اک حادثہ گذر جائے
غم حیات یہاں تک اثر تو کر جائے
کہ مسکراؤں تو چہرہ مرا اُتر جائے
یہ میرا دل ہے یہاں وضع دار بنتے ہیں
جو مسکرا نہیں سکتا وہ زخم بھر جائے
وسیم جتنی بھی ممکن ہو راہ طے کر لو
قدم حیات کا جانے کہاں ٹھہر جائے

لوٹ چلے پھر آنکھوں سے آنسو اور ترا دامن پاس نہیں

ہائے یہ راہی جن کو ابھی تک دوری منزل راس نہیں

میرے شعروں کو سن سن کر یوں سرگوشی کرتے ہو

اپنی تباہی کا اے لوگو! جیسے مجھے احساس نہیں

راہِ وفا کے فاصلے کچھ معتبر نہ تھے
اچھا ہوا کہ آپ مرے ہمسفر نہ تھے
ہم غم نصیب لوگوں کے یہ ہمسفر نہ تھے
دو طنز تھے حیات پہ شام و سحر نہ تھے
اچھا ہوا کہ ہم سے بہت دور ہو گئے
ہم لوگ زندگی کے لئے معتبر نہ تھے
اے دور لو! ہمارا مقدّر وہی رہا
کیا ہم شریک گردشِ شام و سحر نہ تھے
سازش کہوں کہ تشنہ لبی پر یہ طنز تھا
ساقی کی اُنگلیوں کے نشاں جام پر نہ تھے
کیوں نامُراد آیا ہے اے شاعرِ حیات
دُنیا میں کیا وسیم کچھ اہلِ نظر نہ تھے

خشک آنکھیں ہیں تو دل ہی مرا ویران ہے

کچھ تو اے گردشِ دوراں تری پہچان رہے

کتنا محسوس کیا تھا غمِ دنیا ہم نے

تیری محفل میں بھی پہنچے تو پریشان رہے

آج آ جائے تو لمحاتِ جدائی کٹ جائیں

آج کی نیند کا آنکھوں پہ بھی احسان رہے

اور کیا ہوتا زمانے کے لئے جی کے نسیم

چند سانسوں کے مری زیست پر احسان رہے

خشک آنکھیں ہیں پلک بھی نم نہیں
اب کوئی آنسو شریکِ غم نہیں
جس کو لوگ آپس میں ملکر بانٹ لیں
زندگی ایسا بھی تیرا غم نہیں
رونے والے مسکرانا سیکھ لے
ہو سکے تو پھول بن شبنم نہیں
لاش ہے اپنے تبسم کی وسیم
پھول کی آغوش میں شبنم نہیں

کون سے دل میں کچھ افسانے نہیں
ہاں مگر دنیا نے پہچانے نہیں
قدر کر اے خشک آنکھوں کی ندیم
لوگ میرے غم کو پہچانے نہیں

اے دور نو مرا یہ تعارف بھی کم نہیں
اک یادگار گردش چرخ کہن ہوں میں
راہ وفا میں آج مرے ہمسفر مجھے
یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی راہزن ہوں میں
زخموں کے اندمال کی خواہش نہیں ندیم
اچھا ہے اپنی ذات سے اک انجمن ہوں میں

مسکراتا ہوں دلِ ناکام سے
پی رہا ہوں مئے شکستہ جام سے

آج بھی اس زندگی کی لاش میں
جان پڑ جاتی ہے تیرے نام سے

شام کی لذت سے بیگانے رہے
صبح کا غم کرنے والے شام سے

سوچتا ہوں آج کی یہ بستیاں
کل پکاری جائیں گی کس نام سے

لمحہ لمحہ کٹ رہی ہے زندگی
قطرہ قطرہ بہہ رہا ہے جام سے

اب کوئی تارا نہ ٹوٹے صبح تک
میں نے آنسو پی لئے ہیں شام سے

جانے کیسی ہوگی خود وہ زندگی
جی رہے ہیں لوگ جس کے نام سے

اک تسلسل ختم ہو جاتا وسیم
موت آجاتی اگر آرام سے

ٹھوکروں سے کیوں سکونِ دل نہیں
زندگی اک راہ ہے منزل نہیں
اور تدبیریں مری ناکام کر
مَیں ابھی تقدیر کا قائل نہیں
چھوڑ دو تم بھی مجھے سب کی طرح
راستو! میری کوئی منزل نہیں
آنسوؤں پر اس طرح ہنستے ہیں لوگ
جیسے غم کا کوئی مستقبل نہیں
اپنے ماضی کو نہ دوہراؤ وسیم
سب کے سینے میں تمہارا دل نہیں

اس طرح مرا ذوقِ سفر کھو سا رہا ہے
جیسے کہ نہ ملنا مری منزل کی خطا ہے
ہر روز بدلتے ہیں مری زیست کے خاکے
ہر شام ترے درد کا انداز نیا ہے

تیری خفگی بھی اک حادثہ بن گئی میری خاموشیاں ان کہی کہہ گئیں
سب کی نظریں اسی اک دریچے پہ تھیں جو ترستا رہا روشنی کے لئے
گمرہی میں نے تسلیم کر لی مگر تجھ سے وعدہ کیا تھا نبھاتا رہا
تیری یادوں کے سہمے ہوئے قافلے کتنے بے چین تھے رہبری کے لئے
تیرے بارے میں کل سوچتے سوچتے جانے کس وقت آنکھوں میں نیند آ گئی
میری تنہائی کا یہ نیا تجربہ کچھ انوکھا سا تھا زندگی کے لئے

بس غمِ دوریِ منزل، مری دن بھر کی تھکن،
کون دیکھے گا مری شامِ سفر کیسی ہے
راستوں میں بھی تو لٹنے کی روایت ہے ندیمؔ
ہر مسافر کی یہ منزل پہ نظر کیسی ہے

مری شاعری ہے مجھ کو جو تمام کر رہی ہے
یہ وہ لو ہے خود دیئے پہ جو گراں گذر رہی ہے

مجھے بے زبان کر کے مرا حال پوچھتے ہو
تمہیں کیا خبر کہ دل پر مرے کیا گذر رہی ہے

میں سکون چاہتا تھا سرِ راہ کیسے ملتا
کسی راہبر کی منزل کہیں ہم سفر رہی ہے

یہی بزمِ عیش ہوگی یہی دورِ جام ہوگا
مگر آج کا تصور یہاں کل حرام ہوگا

میں کچھ اس طرح جیا ہوں کہ یقیں ہو گیا ہے
مرے بعد زندگی کا بڑا احترام ہوگا

مری زیست اک جنازہ ہے جو راہِ وقت میں ہے
جو تھکیں گے دن کے کاندھے تو سپردِ شام ہوگا

یہی حادثاتِ غم ہیں تو یہ ڈر ہے جینے والو
کوئی دن میں زندگی کا کوئی اور نام ہوگا

سرِ رہگذر بھٹکنے پہ وسیم مطمئن ہوں
یہ سنا ہے جب سے منزل پہ سکون عام ہوگا

مرے شعر مری سانسیں ہیں وسیم زندگی کی
یہ نہ ہوں تو سارا قصہ ہی مرا تمام ہوگا

تجھے جو دیکھا تو آنکھوں میں آ گئے آنسو
تری نظر سے تری آرزو چھپا نہ سکا
اس اک گناہ کی قیمت نہ جانے کیا ہوگی
یہ سوچ کر میں ذرا دیر مسکرا نہ سکا
وسیم کچھ نہ دیا میں نے اس زمانے کو
وہ تیل کیا جو چراغوں کے کام آ نہ سکا

آنکھ پھر اک حسیں کی نم ہے
آج پھر آزمائش غم ہے
ایک مجبور کے تبسّم میں
اور سب کچھ ہے زندگی کم ہے
اپنے دامن میں جذب کر لیجے
میرے اشکوں کی زندگی کم ہے

زندگی کس لئے جینے کا گماں رکھتی ہے
سانس چلتی ہے مگر پاؤں کہاں رکھتی ہے
سب پہ آتی ہوئی باتوں کے سمجھنے والو
خامشی بھی کبھی اک طرزِ بیاں رکھتی ہے

نظر میں آئیں گے چہرے نہ جانے کس کس کے
دعائیں مانگئے محفل میں روشنی کم ہو

---

گذر رہی ہے گذرنے دو بے سہارا ہی
وہ زندگی جو کسی اور کام کی بھی نہیں
جو اشک بن نہ سکے شعر بن گئے وہ غم
وسیم بات چھپائی مگر چھپی بھی نہیں

---

دیکھا ان آنکھوں میں اک اشک نہ چھوٹا ہم نے
کس قدر پاس کیا ہے تیرے غم کا ہم نے

زندگی آج حقیقت ہے کل افسانہ تھی
بھول جاؤ کہ کبھی پیار کیا تھا ہم نے

یہ سمجھ کر کہ یہ نعمت بھی کسے ملتی ہے
لمحۂ غم کو بھی ہنس ہنس کے گذارا ہم نے

آج تک جس کی سزا کاٹ رہے ہیں جو ستم
زندگی کے بڑا جرم کیا تھا ہم نے

# قطعات

زندگی زندگی کا غم ہو جائے
عشق کا حوصلہ نہ کم ہو جائے
لے مرے اشک پونچھنے والے
تیرا دامن کہیں نہ نم ہو جائے

---

اپنا احساس کھو کے پیتا ہوں
میں ترے غم کو رو کے پیتا ہوں
مجھ کو میکش سمجھ رہا ہے تو
میں تو مجبور ہو کے پیتا ہوں

تو نے پالا ہے تیرا کیا لیں گے
زندگی بھر تجھے دُعا دیں گے
باغباں چھوڑ دے انھیں یہ پھُول
اور کچھ دیر مُسکرائیں گے

---

آنسوؤں کے لئے ترستا ہوں
داغ دھونا بھی میرے بس میں نہیں
مُسکرانے کی بات کرتے ہو
اب تو رونا بھی میرے بس میں نہیں

تم تو ہنس مکھ تھے قبر پر میری
کس لئے محو یاس بیٹھے ہو
میں زمانے سے روٹھ آیا ہوں
ہائے تم کیوں اُداس بیٹھے ہو

---

ہر ایک پھول کے دِل میں گھُٹا گھُٹا سا دھواں
بہار ایسی کسی کی نظر سے گذری ہے
یہ سوگوارئ گلشن بتا رہی ہے دبیم
کوئی اُداس حسینہ اِدھر سے گذری ہے

ختم کب ہو یہ کچھ نہیں معلوم

ہر نفس پر ہے موت کا خطرہ

زندگی اس طرح ہے دُنیا میں

جیسے کانٹے پہ اوس کا قطرہ

---

منزلیں دور ہوتی جاتی ہیں

فاصلے ہیں کہ کم نہیں ہوتے

ہائے قسمت کہ اب شریکِ سفر

میرے اپنے قدم نہیں ہوتے

عشق کا اعتبار بن کے رہو

میرے دل میں قرار بن کے رہو

اور زیادہ کرے خدا یہ جمال

ہر نظر میں بہار بن کے رہو

---

بہت دنوں میں جو دیکھا تو دیکھ کر تم کو

خموش ہے دلِ شاعر کی اس طرح دھڑکن

گزشتہ شب کی تصوّر فروشیوں کے بعد

سہاگ رات کو جیسے تھکی ہوئی دُلہن

میرے شعروں کو تیری دُنیا میں

میرے دل کا غبار لایا ہے

میرے شعروں کو غور سے مت سُن

ان میں تیرا بھی ذکر آیا ہے

---

ان سے وابستگی نہیں جانی

زندگی کس طرح گذاروں گا

جتنی باتیں ہیں اتنی یادیں ہیں

کیسے کیسے انھیں بھلاؤں گا

میں شرابی ہوں میری کوشش ہے
درد زندہ شراب زندہ ہے
اس نزاکت کو سوچ لے واعظ
میرے دم سے عذاب زندہ ہے

---

کیسی توہین لفظ ہستی ہے
رہنے والو یہ کیسی بستی ہے
موت کو لوگ دیتے ہیں کاندھا
زندگی رحم کو ترستی ہے

دل کی وادی میں اُترتے ہوئے سہمے سہمے

تیری محبوب نگاہوں کے وہ آہستہ قدم

جیسے اک شوخ حسینہ کی کسی باجے پر

اُنگلیاں پہلے پہل ڈھونڈ رہی ہوں سرگم

مشاعرے میں کل اک نازنین نے مجھ سے بہ تبسّم

کہا بغیر ترنّم کے آپکی یہ غزل

لگی حسین مگر بالکل اس طرح جیسے

اندھیری رات کی خاموشیوں میں تاج محل

خود کو یوں ختم کر کے اک مے خوار

مسکراتا ہے اور پیتا ہے

جیسے ہندوستاں کا فنکار

اپنے مرنے کے بعد جیتا ہے

---

موت کے بعد بھی تو چلتا ہے

زندگی تیرے جبر کا ناٹک

پھول ہنستے ہوئے ہی جاتے ہیں

شاخ سے باغباں کی جھولی تک

میری تنہائیوں سے تیری یاد
جب ترا ذکر چھیڑ دیتی ہے
یوں بہت سے خیال آتے ہیں
جیسے اک کنکری کے گرنے سے
اک تلیہ کے ٹھہرے پانی میں
گھیرے پڑتے ہیں پھیل جاتے ہیں

---

میری تنہائیاں بھی شاعر ہیں
نذر اشعار و جام رہتی ہیں!
اپنی یادوں کا سلسلہ روکو
میری نیندیں حرام رہتی ہیں

شمع کی طرح آج محفل میں
جل رہا ہوں میں روشنی کے لئے
کوئی دیکھے تو میری مجبوری
شعر کہتا ہوں زندگی کے لئے

---

اب بھی ہر لب میں اور تبسّم میں
حدّ فاصل ہے ایک دوری ہے
کتنی صدیاں گذر چکیں لیکن
زندگی آج بھی ادھوری ہے

جانے کیسے وسیم کے دل نے
اک ذرا سا سکون پایا تھا
یادِ ماضی نے بڑھ کے ٹوک دیا
کتنی مشکل سے مُسکرایا تھا

زندگی درد لادوا بھی ہے

اور ایک مستقل سزا بھی ہے

ہائے معصومیٔ دلِ انساں

زندگی ہی کا آسرا بھی ہے

---

خستہ حالی ہے اور دلِ حساس

دوستی کو بھی دشمنی جانوں

اے تبسم! نہ آمرے لب پر

میں کہیں تجھ کو طنز یہ سمجھوں

# غزلیات

# میری تصویر

وہ دن کہ تم نے مجھے پہلی بار دیکھا تھا
مجھے کہاں میری تصویر کو جو کانس پہ
مری خموش کتابوں کے ساتھ رکھی تھی
ادائے ناز سے وابستہ اجنبی بنکر
"یہ کون ہیں؟" مری بہنوں سے تم نے پوچھا تھا
"نہیں تو لگتا ہے جیسے کہیں یہ دیکھا تھا"

جواب ان سے تمہیں کیا ملا یہ تم جانو
مگر یہ کہتی تھیں تم بھی کہ انکی جرأت پر
حیا کے بوجھ سے نظریں نہ اُٹھ سکیں پھر بھی
زباں سے کچھ نہ کہا تم نے اس شرارت پر"

ادا سے رکھ کے جھکی آنکھ پر ہتھیلی کو
شبہ میں ڈال دیا تھا ہر اک سہیلی کو

وہ دن کہ سارے زمانے کی آنکھ سے چھپکر
مرے خیالوں میں رہنے کی آرزو کی تھی
نظر کے سامنے تصویر رکھ کے راتوں کو
مری خموش نگاہوں سے گفتگو کی تھی

ہر ایک شعر کو خلوت میں گنگنایا تھا
خموشیوں میں ترنم مرا ابھرایا تھا

کسی بہانے سے آئیں تم اور آتی رہیں

وفا کے ساز پہ روحوں کا رقص ہوتا رہا

تکلّفات اُٹھے اور تم اجنبی نہ رہیں

حسین زلف کے سائے میں پیار سوتا رہا

قریب رہ کے محبّت کی منزلیں سمجھیں

بہت سی راتیں بڑی احتیاط سے گذریں

مرا خیال کتابوں سے دور رہنے لگا

تمہاری یادیں مرا کافی وقت لینے لگیں

سہیلیاں تمہیں مغرور کہہ کے چھوڑ گئیں

تم اپنا وقت مری شاعری کو دینے لگیں

تمہاری آنکھوں میں چھپکر سرور رہنے لگا

مجھے وفاؤں پہ اپنی غرور رہنے لگا

لبوں کا پاک تبسّم لبوں کی حد میں رہا
دلوں کی باتیں نگاہوں تک آ کے لوٹ گئیں
تم ایک روز انوکھی سی احتیاط کے ساتھ
مری کھُلی ہوئی باہوں تک آ کے لوٹ گئیں
یہ ایک ایسی ادا تھی کہ مَیں نے کچھ نہ کہا
بس احترام سے باہوں کو اپنی چوم لیا
مگر چراغ ہمیشہ کہیں نہیں جلتے
یہ زندگی ہے زمانے کے ساتھ چلتی ہے
خوشی کی عمر کا لمحے حساب کرتے ہیں
حسین ہو تو محبّت نظر بدلتی ہے
یہ حادثات کہاں تک خلاؤں میں پلتے
کہاں تک اپنی محبّت کے مشغلے چلتے

تمہاری پاک محبّت پہ بدگماں نظریں
اُٹھی ہوئی تھیں مگر پھر بھی آرہی تھیں تم
تمہارے آنے میں وہ بے تکلّفی نہ رہی
اب ایک رسم تھی جس کو نبھا رہی تھیں تم
بنی ہوئی تھیں محبّت کا امتحاں نظریں
کس احتیاط سے اُٹھتی تھیں بے زباں نظریں

تم امتحاں کی ہر راہ سے گذرتی رہیں
ادا سے شمعِ محبّت مگر جلائے ہوئے
کچھ آرزوئیں محبّت کی موت مرتی رہیں
مرے خیالوں کو ہر سانس میں چھپائے ہوئے
خموشیوں میں وفاؤں کا رنگ بھرتی رہیں
تغیرات کی فطرت سے جنگ کرتی رہیں

تمہارے دل میں خموشی سے آگ جاگ اٹھی
میرے خیال میں اُبھرے نئے نئے خاکے
ہمارے ماتھے کی شکنیں اُبھر کے ڈوب گئیں
ہمیں نے بل کے بغاوت کے خواب بھی دیکھے
مگر زمانے کے آگے ہماری اک نہ چلی
جو اُٹھ چلی تھی وہ آندھی دیوں سے رُک نہ سکی
تمہارے پاس شرافت کی پاسداری تھی
جسے زمانہ کوئی اہمیت نہیں دیتا
تمہارے پاس حیا کا حسین زیور تھا
جسے یہاں پہ کوئی مفت بھی نہیں لیتا
مرے خدا نے دیا آدمی نے چھین لیا
تمہیں رواج کی شوخی نے مجھ سے چھین لیا

تمہارے گھر میں امارت کا اہتمام نہ تھا
کہ جس سے جسم کی بولی لگائی جاتی ہے
پھر ان ضمیر فروشوں کا تجربہ بھی نہ تھا
جو سود لیتے ہیں انسان کی جوانی سے
خزاں سے دیتے ہیں جشنِ بہار کا بدلہ
وصول کرتے ہیں معصوم پیار سے قرضہ
زمانہ اپنے طریقوں پہ ناز کرتا ہے
میں دور ہونے پہ مجبور ہو گیا تم سے
رواج و رسم و مقدر کی پاسبانی میں
قریب آکے بہت دور ہو گیا تم سے
روایتوں کا گرایا ہوا سنبھل نہ سکا
قدم اُٹھائے مگر اپنی راہ چل نہ سکا

یہ مختصر سی کہانی چلو تمام ہوئی

نئے سفر کو نیا دل بنا لیا تم نے
ان اعتبار فروشوں کی بستیوں سے دور
چراغ شام غریباں جلا لیا تم نے
سحر کی نور مزاجی سپرد شام ہوئی
یہ مختصر سی کہانی چلو تمام ہوئی

مگر یہ روپ بدلنا تمہیں نہ راس آیا
تمہارے دل کو نئے مشغلے نہ جیت سکے
چراغ تیل کی کثرت سے ٹمٹما اٹھا
طبیب آئے علاجوں کے بعد لوٹ گئے
رگوں میں پھیل گئی پردہ دار غم نہ ہوئی
وفا کی آگ بھڑک کر دوا سے کم نہ ہوئی

مرض تمہارا دواؤں سے بات کھا نہ سکا
کچھ ایسے زخم تھے دل پر کہ مندمل نہ ہوئے
اجل قریب تھی پھر بھی نفس کی بندش میں
وہ درد تھے کہ ہواؤں میں منتقل نہ ہوئے
تمہارے پاس سے گذرا قریب جا نہ سکا
یہ اتفاق تمہیں دیکھنے بھی آ نہ سکا
زمانہ اپنے کئے پر بہت پشیماں تھا
مگر اداس بغاوت کے آگے اک نہ چلی
اب اہتمام چراغاں سے بزم کیا سجتی
چتا میں آگ لگاتا رہا چتا نہ جلی
ہر احتیاط کے باوصف زخم بھر نہ سکا
مری اداس نگاہی کو ختم کر نہ سکا

ادھر شباب مرا شاعری میں ڈھلنے لگا

ادھر طبیب کے ہاتھوں سے نبض چھوٹ گئی

ادھر میں شعروں میں دل کا لہو اگلنے لگا

ادھر تمہاری جوانی کی شام آپہونچی

جمی ہوئی تھیں نگاہیں فرازِ ساحل پر

اب اپنے پاؤں سفر میں تھے آنکھ منزل پر

غموں کی آنکھ مری بے کسی پہ بھر آئی

مرے لبوں کا تبسم نے ساتھ چھوڑ دیا

تمہارے بعد مری زیست میں خموشی تھی

کہ جس کو میرے ہی شعروں نے مل کے توڑ دیا

نہ جانے کیسے یہ سانسوں میں ڈوب کر آئی

تمہاری یاد ہر اک شعر میں اُتر آئی

تم آج میری عیادت کو کیوں چلی آئیں
تمہیں تو خود بھی اب آرام کی ضرورت ہے
یہ اُترا اُترا سا چہرہ یہ مضمحل سے نقوش
تغیّرات سے مجھ کو بڑی شکایت ہے

عجیب طرح رسومِ حیات اپنائیں
یہ تم ہو یا ہے تمہاری وفا کی پرچھائیں
تم آگئی ہو تو کچھ یاد آرہا ہے مجھے
مری نگاہوں کے آگے کتابِ ماضی ہے
مگر یہ سوچ کے پائے خیال رک سے گئے
کہ میرا حال ہی میرا جواب ماضی ہے
میں مطمئن ہوں کہ اک غم اُبھار رہا ہے مجھے
بڑی ادا سے زمانہ مٹا رہا ہے مجھے

یہ دیکھ لو وہی کمرہ ہے جس میں پہلی بار
مرے شباب کی تصویر تم نے دیکھی تھی
تمہارے سامنے کارنس ہے اور وہی تصویر
وہیں پہ رکھی ہے اس دن جہاں پہ رکھی تھی
مگر فریم کے شیشے پہ جم گیا ہے غبار

غبار جس نے تمہیں دور کر دیا مجھ سے
نگاہ بھر کے تمہیں دیکھ بھی نہیں سکتا
تمہیں بھی میرے خد و خال کیا نظر آئیں
نہ جانے کب تک اٹھے گا یہ خاک کا پردہ
وہ خاک جس نے تمہیں دور کر دیا مجھ سے
غبار جس نے مرا خواب لے لیا مجھ سے

# "ماضی"

تھکی ہوئی جوڑی کی شب ہے اداس تاروں کا قافلہ ہے
مشاغلِ زندگی کا افسوں خموش راہوں میں کھو چکا ہے
کہیں دیئے ٹمٹما رہے ہیں بجھے اندھیرے سلگ گئے ہیں
سلگتے ہونٹوں پہ ان کے خوابیدہ کتنی راتوں کا مرثیہ ہے
فضا میں جھپکی کی سوئی آنکھوں پہ اس طرح سے جھکی ہوئی ہیں
ستارے جیسے گلے لگا کے ابھی کوئی تھک کے سو گیا ہے
مگر امارت کے مشغلوں کو نظامِ فطرت کا غم نہیں ہے
ہے اک محلے میں جشنِ شادی جہاں چراغوں کا سلسلہ ہے

حسین آرائشوں سے ماحول کی ادائیں بدل گئی ہیں

سُہاگ گیتوں نے مل کے خاموشیوں کو بیباک کر دیا ہے

بڑے گھرانے کی اک لڑکی نیا سفر کلپتے ارادے

کہار ڈولا اُٹھا رہے ہیں سُہاگ سانسوں میں گھُل رہا ہے

اسی محلے کے اک اندھیرے مکاں میں اک نوجواں اکیلا

اُداس بیٹھا ہوا مُقدّر پہ اپنے آنسو بہا رہا ہے

حسین یادیں سمٹ رہی ہیں پرانے خط مسکرا رہے ہیں

قریب رکھی ہوئی انگیٹھی میں اپنا ماضی جلا رہا ہے

# "بنجارن"

چند خیمے نصب ہیں اک سردیوں کی رات ہے
شہر سے کچھ دور ہے خانہ بدوشوں کا پڑاؤ
ٹمٹماتے ہیں دیے خیموں کے اندر شام سے
مفلسی کے تنگ سے حلقے میں سلگتے ہیں الاؤ

چند بنجارے خلاف شرع مونچھوں کو چڑھائے
آگ حلقے میں لئے بیٹھے ہیں اس ترکیب سے
پھول کے چاروں طرف اخذ حرارت کے لئے
جیسے کچھ کانٹے نکیلے اور بے ترتیب سے

دن کی محنت کا نتیجہ رات کٹنے کا سوال
اُٹھ رہا ہے بن کے ان چولہوں کے سینے سے دھواں
جن کی صحبت میں قبیلے کی کنواری لڑکیاں
تجربے دن بھر کے کرتی ہیں نگاہوں سے بیاں
لیکن آج ان کی زبانیں بند سر غم سے نگوں
ہر نظر دل میں لئے بیٹھی ہوئی ہے اک سوال
عورتیں خاموش مردوں کی زبانیں لاجواب
حادثہ ہے ایک لیکن مختلف سے ہیں خیال
اس قبیلے کی کوئی نوعمر لڑکی صبح سے
قینچیاں لیکر گئی تھی بیچنے کے واسطے
شہر کی ان کوٹھیوں اونچے مکانوں کی طرف
سنتری روکے کھڑے رہتے ہیں جن کے راستے

کوٹھیاں وہ جن کے چہرے گرد سے واقف نہیں
جن کے سینوں میں جوانی کی اٹھانیں دفن ہیں
ظاہرا یہ کوٹھیاں خاموش رہتی ہیں مگر
ان کے کمروں میں ہزاروں داستانیں دفن ہیں
لیکن اتنی رات ہونے آئی اور لوٹی نہیں
جانے بیچاری پہ کیا گذری یہ سب کو فکر ہے
ایک بنجارن قبیلے بھر کی عزت کا سوال
وہ بڑی خوددار تھی یہ ہر زباں پر ذکر ہے
ایک کہتا ہے چلو تھانے میں چل کر لو لکھا
دوسرا کہتا ہے ”پہلے بھی گئے تھے کیا ہوا“
سیٹھ بھی شہروں کے ہیں شہروں کے تھانیدار بھی
سب کو آتا ہے ہماری آبرو سے کھیلنا
مفلسی میں جوہر ناموس کی قیمت نہیں
چیتھڑوں میں ہو اگر عصمت تو پھر عصمت نہیں

شہر کے تہذیب داروں کی نظر میں بھائیو!
اک غریب انسان کی عزت کوئی عزت نہیں
تمقموں کی دسترس میں جگمگاتی کوٹھیاں
چھن رہی ہے جن کے پردوں سے اندھیری روشنی
ہم غریب انساں گھبراتے ہیں اس احساس سے
بڑھ کے خیموں تک نہ آجائے یہ ان کی روشنی"
بوڑھے بنجارے کی یہ تقریر اور یہ حادثہ
شہر کے کم ظرف انسانوں پہ دل رونے لگا
کس قدر غمگیں تھا میں گھر پہونچنے پر وسیم
جانے کتنے مسئلے پہلو میں لیکر سو گیا
صبح کو اخبار کی سُرخی پہ نظریں جم گئیں
"سیٹھ دامودر کے کوٹھی پر بھیانک سانحے
ایک بنجارن تحفظ کرتے کرتے جسم کا
اوپری منزل سے گر کر مر گئی کل چھ بجے"

# "دیوانے کی جنت"

میرا یہ خواب کہ تم میرے قریب آئی ہو
اپنے سائے سے جھجکتی ہوئی گھبرائی ہوئی
اپنے احساس کی تحریک پہ شرمائی ہوئی
اپنے قدموں کی بھی آواز سے کترائی ہوئی
اپنی سانسوں کے مہکتے ہوئے انداز لیے
اپنی خاموشی میں گہناتے ہوئے راز لیے
اپنے ہونٹوں پہ اک انجام کا آغاز لیے
دل کی دھڑکن کو بہت روکتی سمجھائی ہوئی
اپنی آنچل کی ہوا بازی پہ کھسیائی ہوئی
اپنی پائل کی غزل خوانی پہ جھنجھلائی ہوئی

نرم شانوں پہ جوانی کا نیا بار لئے
شوخ آنکھوں میں حجابات سے انکار لئے
تیز نبضوں میں ملاقات کے آثار لئے
کالے بالوں سے بکھرتی ہوئی چمپا کی مہک
سُرخ عارض پہ دمکتے ہوئے شعلوں کی چمک
نیچی نظروں میں سمائی ہوئی خوددار جھجک
نقرئی جسم پہ وہ چاند کی کرنوں کی پھوار
چاندنی رات میں بجتا ہوا پلکوں کا ستار
فرطِ جذبات سے بہکی ہوئی سانسوں کی قطار
دورِ ماضی کی بد انجام روایات لئے
نیچی نظریں وہی احساس ملاقات لئے
وہی ماحول وہی تاروں بھری رات لئے

آج تم آئی ہو دہراتی ہوئی ماضی کو

میرا یہ خواب کہ تم میرے قریب آئی ہو

کاش اک خواب رہے تلخ حقیقت نہ بنے

یہ ملاقات بھی دیوانے کی جنت نہ بنے

# "دیوانے دو"

صرف احساس جدائی سے بہلتے رہنا
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سنبھلتے رہنا
بیکسی اور یہ اُترا ہوا چہرہ شب کا
میں اکیلا ہوں مرے ساتھ میں چلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغو! ابھی جلتے رہنا

ابھی اُمیدوں کی نظروں میں چمک باقی ہے
ابھی ان بیلے کی کلیوں میں مہک باقی ہے
ان کے آنے کی توقع تو نہیں ہے پھر بھی
سوچنے کے لئے گنجائشِ شک باقی ہے
سیکڑوں غم سے ہی ممکن ہے سنبھلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغو! ابھی جلتے رہنا

میرے حالات اگر ان کی نظر میں ہونگے
میرے اشکوں کی طرح وہ بھی سفر میں ہونگے
ذہن مانوس نہیں ایسے تخیّل سے مگر
دل یہ کہتا ہے کہ وہ راہگذر میں ہونگے
دِل کی خاطر ہی ابھی آنکھوں کو ملتے رہنا
اور کچھ دیر چراغو! ابھی جلتے رہنا

دورِ مغموم کی تصویر بدل سکتی تھی
میرے ہر خواب کی تعبیر بدل سکتی تھی
ایک انمول مُسافر کے نقوش پا سے
آج ان راہوں کی تقدیر بدل سکتی تھی
تھک گئے ہو تو ذرا پہلو بدلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغو! ابھی جلتے رہنا

سوچتا ہوں کئی اُمّید سحر میں ہونگے
کتنے ہی میری طرح اور سفر میں ہوں گے
اپنی منزل کی تمنّائیں لئے حسرت سے
کتنے افسانے ابھی راہ گذر میں ہونگے
تم ہواؤں کے ارادوں کو بدلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغو! ابھی جلتے رہنا

ڈھل چلی رات ہوئے بند لب زخم جگر
رہ گئی دل میں اندھیروں کے تمنّائے سحر
کوئی آیا نہ اِدھر رات کے سنّاٹوں میں
منتظر ہی رہی معصوم دُعاؤں کی نظر
اب کس اُمّید پہ کہدوں کہ بہلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغو! ابھی جلتے رہنا

تھک گیا درد ٹھہرنے لگے سانسوں کے قدم
غم کے احساس سے گھٹنے لگا اُمیّد کا دم
نا اُمیدی نے اُمیدوں کو کہاں چھوڑ دیا
کھُل نہ جائے مری خاموش محبت کا بھرم

عمر بھر میری طرح آگ میں جلتے رہنا
راس آیا نہ تمہیں بھی یہ پگھلتے رہنا
تم بھی بجھ جاؤ مرے دل کو بھی بجھ جانے دو
آخری بار مری آنکھوں کو بھر آنے دو
آج کی رات محبت پہ گراں گذرے گی
ختم ہو جائیں گے اک ساتھ ہی زیلوانے دو"

# "تری یاد"

میں تری یاد کو سینے سے لگائے گذرا
اجنبی شہر کی مشغول گذرگاہوں سے
بے وفائی کی طرح پھیلی ہوئی راہوں سے
نئی تہذیب کے آباد بیابانوں سے
دست مزدور پہ ہنستے ہوئے ایوانوں سے
میں تری یاد کو سینے سے لگائے گذرا
گاؤں کی دوپہری دھوپ کے سناٹوں سے
خشک نہروں کے کناروں پہ تھکی چھاؤں سے
اپنے دل کی طرح روئی ہوئی پگڈنڈی سے
جشن تنہائی میں کھوئی ہوئی پگڈنڈی سے

میں تری یاد کو سینے سے لگائے پہونچا

بستیاں چھوڑ کے ترسے ہوئے ویرانوں میں

تلخیٔ دہر سمیٹے ہوئے میخانوں میں

خونِ انساں پہ پلتے ہوئے انسانوں میں

جانے پہچانے ہوئے لوگوں میں انجانوں میں

میں تری یاد کو سینے سے لگائے پہونچا

اپنے احباب ترے غم کے پرستاروں میں

اپنی روٹھی ہوئی تقدیر کے غم خواروں میں

اپنے ہم منزل و ہم راستہ فن کاروں میں

اور فن کار کی سانسوں کے خریداروں میں

میں تری یاد کو سینے سے لگائے پہونچا
یہ سمجھ کر کہ کوئی آنکھ ادھر اُٹھے گی
میری معصوم نگاہی کو مجھے سمجھے گی
لیکن اے دوست یہ دُنیا ہے یہاں تیرا غم
ایک انسان کو تسکین بھی دے سکتا ہے
ایک انسان سے آرام بھی لے سکتا ہے
خون میں ڈوبی ہوئی تحریر بھی بن سکتا ہے
ایک فن کار کی تقدیر بھی بن سکتا ہے
ساری دُنیا کے مگر کام نہیں آسکتا
سب کے ہونٹوں پہ ترا نام نہیں آسکتا

# "شورُوم سے گلمرگ تک"

کشمیر کی حسین وادی "گلمرگ" میں ایک حادثے سے
متاثر ہو کر لکھی گئی ایک نظم

---

ایسا لگتا ہے کہ جاگیر ہو ان ہونٹوں کی
یہ تبسم یہ تکلم یہ گلابی رنگت!
ایسا لگتا ہے کہ اک شعر کے دو مصرعوں میں
ایک شاعر نے سمو دی ہو غزل کی قسمت

نیند یا آنکھوں پہ ترتیب سے پلکوں کا جھکاؤ
جیسے میخانوں پہ بدمست گھٹائیں جھومیں
جیسے ڈل لیک کے خاموش کناروں پہ چنار
چاندنی رات میں کچھ سوچ کے سایہ کر لیں

مخملی شانوں سے اُتری ہوئی کالی زلفیں
جیسے سمٹی ہوئی راتیں کسی میخانے کی
روشنائی سے ابھی لکھ کے ہٹا ہو جیسے
کوئی دو سُرخیاں اک حسن کے افسانے کی
کان کی بالیاں ٹھہرا ہوا وہ جادو ہیں
چال کے ساتھ جو چلتا ہے تو سناٹوں میں
نغمگیں ہو کے کئی راگ بکھر جاتے ہیں
اور ڈھل جاتا ہے سنگیت مری سانسوں میں
چمپئی رنگ پہ ٹھہری ہوئی اک سُرخ لکیر
دست قدرت کی مہارت کا پتہ دیتی ہے
بڑھ کے خورشید کی اکثر کوئی گستاخ کرن
ایک رنگ اور انھیں رنگوں میں ملا دیتی ہے

ایسا لگتا ہے کہ بہزاد کی تصویر کوئی
اپنے شوروم کی تنہائی سے گھبرائی ہو
اور چپکے سے کسی شب کا سہارا لیکر
صُبحِ گلمرگ کی باہوں میں چلی آئی ہو
اتنے معصوم سے لہجوں کی روایات کہاں
تجربہ کار نگاہوں کے یہ انداز نہیں
ابھی راتیں ہی نہیں دن میں بھی لگ جاتی ہیں
ابھی ان آنکھوں کے سینہ میں کوئی راز نہیں
اتنی نادانی بھی آنکھوں کی ہے تشریح طلب
میرے بے ربط خیالوں کو حجاب آتا ہے
کتنے بھرپور ہیں ان نرگسی آنکھوں کے جواب
کہ مرے اپنے سوالوں کو حجاب آتا ہے

جسم ان اجنبی راہوں کا کہاں عادی ہے

ہر نئے موڑ کے آغاز پہ بل کھاتا ہے

لے کہاں سکا ہے تمہارا یہ گلابی آنچل

ایسے لمحات میں سینے سے ڈھلک جاتا ہے

تم ہو گل مرگ کی وادی ہے نئی راہیں ہیں

ایسے ماحول میں خاموش سفر کیا معنی

آؤ یہ بھول کے کچھ بات کریں آج کہ کل

جانے پیدا کرے دنیا کی نظر کیا معنی

آؤ گل مرگ سے اک دور کا آغاز کریں

تم مرے ساتھ چلو اور میں خاموش چلوں

تم ہر اک شعر میں دل بن کے دھڑکتی جاؤ

میں نئی نظم کی تخلیق میں مصروف رہوں

# !! میری یہ نظم تمہاری ہے زمانے کی نہیں

آؤ اس نظمیہ شیشے میں اُتاروں تم کو

تم میں کچھ دیر کو میں کھویا ہوا ہوں دیکھو

تم مرے بالوں سے کھیلو مجھے آواز نہ دو

مجھ کو دزدیدہ نگاہوں سے نہ دیکھو دیکھو

اس طرح اپنا تعاقب مجھے منظور نہیں

یہ حجابات سبھی اک افسانہ نہ بن جائیں کہیں

تم مجھے بڑھ کے بُلا لو میں ابھی دور نہیں

بڑھ رہے ہیں بڑی تیزی سے چناری سائے
الوداعی سی ہیں سورج کی پیازی کرنیں
اور کچھ دیر یہ لمحات رہیں گے اپنے
آج کے حادثے بن جائیں گے کل تک یادیں

پرورش پائی ہے تم نے نئے ماحولوں میں
ایک شاعر ابھی اس رنگ سے بے بہرہ ہے
تم بھلا دو اسے اک کھیل سمجھ کر لیکن
میرے دل کے لئے یہ نقش بہت گہرا ہے

# "آندھی کا بہاؤ"

چینی حملے کے موقع پر لکھی گئی نظم!

کسی ہمشیر کی سسکی سے فضا کانپ اٹھی
شب کی تنہائی کے سینے میں نیا تیر لگا
پھر کسی ماں کی مرادوں سے بھری گودیں
ٹوٹ کر کوئی ستارا سرِ شام آن گرا!
پھر ہوئی ایک سہاگن کی کلائی ننگی!
چوڑیاں ہاتھ سے آنکھوں سے گہر ٹوٹ گرے
چھین لی وقت نے سیندور کی ہلکی سی لکیر
دیکھتے رہ گئے اک مانگ کے خاموش سر

پھر کسی ننھے سے بچے نے کیا ماں سے سوال

ماں یہ بازاروں میں گلیوں میں اندھیرا کیوں ہے

آج دیوالی ہے ہر گھر کے دیئے کیوں چپ ہیں

در و دیوار پہ یہ موت کا سایہ کیوں ہے

پھر کئی نام ہیں تاریخ شہیداں کے لئے

ذکر ہے خوں میں نہائے ہوئے انسانوں کا

جن کی ہمت سے یہ توہین گوارا نہ ہوئی

کہ کوئی رنگ دے تاریخ کو افسانوں کا

ایسی تاریخ کہ نہرو نے بڑے فخر کے ساتھ

پنچ شیلا پہ بہت ناز کیا تھا جس میں

اپنے ہمسائے کو تقدیر وفا سمجھا تھا

امن کے لفظ سے آغاز کیا تھا جس میں

اسی تاریخ کا اک اور ورق اُلٹا ہے

جس پہ اب خون سے ہر لفظ لکھا جائیگا

اس کا افسوس رہا امن سے قصّہ چلکر

خوں میں ڈوبے ہوئے الفاظ تک آجائیگا

چینیو! تم نے محبّت کو غلط رنگ دیا

کیا پڑوسی کے یہی طور طریں ہوتے ہیں

آج کے دور میں گذرے ہوئے وقتوں کی طرح

زندہ رہنے کے یہ آثار نہیں ہوتے ہیں

امن عالم کی وہ تحریک وہ نہرو کے اصول

تم نے اس طرح بھلائے ہیں کہ دل روتا ہے

یہ حریفانہ نظر اور یہ سنگین خیال

تم نے اس دیش کا ماضی بھی کبھی دیکھا ہے

آؤ اس دیش کے ویروں سے ملادوں تم کو

آؤ اس ہند کی تاریخ دکھادوں تم کو

تم رہِ حق سے بہت دور نکل آئے ہو

آؤ ہر گام کا انجام بتادوں تم کو

رام کے دیش پہ اُٹھی تو ہے چشمِ راون

روح راناکی عقابوں کی طرح جھپٹیگی

ویر ٹیپو کی غضبناک نگاہیں اُٹھیں

موت اسی دھر میں پانی کی طرح برسے گی

لکشمی بائی ۔ بھگت سنگھ ۔ شواجی کا لہو

اسی دھرتی کی حفاظت کے لئے جیتا تھا

رانا پرتاپ کا دیرو کوئی افسانہ نہیں

یہ شرارہ بھی وطن ہی کے لئے جاگا تھا

بھیم وارجن نے اسی دیش میں پایا تھا جنم

بودھ و نانک کی تمنّا بھی یہیں نکلی تھی

میرے اس دیش کے دو روپ ہیں آؤ دیکھو

دُودھ کی نہریں بھی تلوار کی جھنکاریں بھی

ہم نے سوچا تھا کہ انسان کی اس دُنیا میں

وحشیوں کا سا کوئی کام نہ ہونے پائے

ہم نئی صبح کی تخلیق میں مصروف رہیں

اور یہ صبح کبھی شام نہ ہونے پائے

لیکن اے چین ترقّی کے انوکھے دُشمن

تو نے جو ہم پہ تراشے ہیں وہ الزام بھی دیکھ

ہم تو مصروف تھے تعمیرِ جہاں میں لیکن

تو نے آغاز کیا ہے تو اب انجام بھی دیکھ

ہم کو منظور ہے یہ یُدھ جنونی تیری!

ہم دکھائیں گے تجھے تیری نگاہوں کا تناؤ

بچّے بچّے کا لہو جاگ گیا بھارت میں

اب ترے بس میں نہیں مت کی آندھی کا بہاؤ

---

کل کے حالات تو اب کل ہی بتائے گا تجھے

ہاں مگر ان کٹی فصلیں بھی تجھے کوسینگی

تیرے بدنام اصولوں پہ مرے ہمسائے

آنے والی تری نسلیں بھی تجھے کوسینگی

---

☆

# "آنسو فروش"

میں دل کے زخموں کا بیوپاری ہوں ایک آنسو فروش شاعر
میں زندگی کے اداس چہرے کی جھریاں بیچنے چلا ہوں
نظر کی تشنہ لبی کو میں نے مزاجِ فن میں سمو دیا ہے
سیاہ راتوں سے جو ملی ہیں وہ تلخیاں بیچنے چلا ہوں

گناہ گار آنکھ کے اشارے پلک پہ ڈھلکے ہوئے ستارے
تھکی ہوئی تیرگی کے سائے مٹے مٹے روشنی کے خاکے
لٹے ہوئے کارواں کا ماضی شکست کھائے ہوئے ارادے
میں مردہ انسانیت کے دامن کی دھجیاں بیچنے چلا ہوں

خلوص کی زندگی کے لالے وفا کا خوں جان کی تباہی
جھکی نگاہوں کی کج ادائی جوان ہونٹوں کی بے وفائی
نئے زمانے کی طنز خوئی حسین ماضی کی بے ثباتی
ہزاروں ہونٹوں کی بات کرتی خموشیاں بیچنے چلا ہوں
کوئی خریدو کہ مسکراتی اُداسیاں بیچنے چلا ہوں
کوئی خریدو کہ آج خودداریوں کا ماتھا جھکا ہوا ہے
کوئی خریدو کہ ایک فنکار زندہ رہنا بھی چاہتا ہے
خفیف نظروں سے اپنے فن کو ہر ایک چہرے کو دیکھتا ہے
یہ لمحہ تاریخ ہی کو دیدو کہ اس کا ماضی سے سلسلہ ہے
ہر ایسے لمحے کو اک امانت بنا کے تاریخ نے رکھا ہے
مگر امانت بنا کے رکھنے کا سلسلہ کب تلک رہیگا
رگوں سے فنکار کی کہاں تک یہ قطرہ قطرہ لہو بہے گا

# مُقدّس خون

امریکہ کے سابق صدر جان کینڈی کی دردناک

موت سے متاثر ہو کر لکھی گئی نظم

---

پڑی ہیں نقشۂ عالم کے ایک حصّے پر

اُسی لہو میں کی باقی بچی ہوئی بوندیں

جو بہہ گیا تھا اسی طرح اک صدی پہلے

جسے گناہ کے ہونٹوں کی اک ہنسی کے لئے

بہایا جاتا رہا ہے بہایا جائے گا

کوئی یتیم ہو بیوہ ہو بے سہارا ہو

نظامِ دہر کی مصروفیت نہیں جاتی

حسین ہاتھ بڑھیں لہو کی بوندوں کو
جوان آنکھ میں آنسو کا داغ شرمائے
بکھر کے بال غم بیوگی سے یہ پوچھیں
کہ روشنی کے طلبگار رات کتنی ہے؟
حیات و موت کا فرق اور یتیم معصومی
نظر کے سامنے سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں
نہ یہ خبر کہ ابھی کیا تھا اور ابھی کیا ہے
نہ یہ خیال کہ اب اس کے بعد کیا ہوگا
نہ یہ کہ ایسا لہو بھی زمیں پہ بہتا ہے۔
جب آدمی کے گناہوں کی پیاس بڑھتی ہے
یہی وہ خوں ہے زمیں کے اداس کاندھوں پر
چلے تو برکتیں آغوش کھول دیتی ہیں

یہ وہ لہو ہے جو بہکر ہی رنگ لاتا ہے

ہر ایک قطرے سے ایسے دیئے جلاتا ہے

جنھیں حرم کی شوالوں کی سخت دیواریں

لگا کے دل سے دُعاؤں کی طرح رکھتی ہیں

ہزاروں سال کی تاریخ کا یہ کہنا ہے

کہ اس لہو کی جوانی بہت پُرانی ہے

یہ بے گناہ گنہگار درد انسانی

مسیح بنکے جیا تھا تو دار تک پہونچا

نہ جانے کتنی مقدّس رگوں کی راہوں سے

گذر کے پہونچا تھا مغرب میں ایک انساں تک
مگر زمانے نے اپنی روش نہیں بدلی
کھو یہ خون بہت کم تھا آج بھی کم ہے
اسی طرح جو بہایا گیا تو کیا ہوگا

جلے چراغ بجھائے گئے اگر یوں ہی
تو زندگی کو اندھیرے تمام کر دینگے
رگوں میں سارے اُجالوں کی زہر بھر دینگے

# "خط اور تشبیہ"

ٹوٹی شب یہ اندھیرے یہ گنہگار فضا
اجنبی فکر سے بوجھل یہ تمہارے پاؤں
کس طرح اٹھے مرے گھر کی طرف رات گئے
سوچتا ہوں تو مری سانس رکی جاتی ہے

کتنی مدت کی خموشی کی جگہ کاوی کو
آج کے بعد نہ ملنے کا شبہ بھول سکے
اشک بنتا ہے لرزتا ہے ٹپک جاتا ہے
یہ تقاضہ ہے کہ میں پھر دوں وہ سارے خطوط

جن کے ہر لفظ کا قطرات لہو دے دے کر
تم نے راتوں کی خموشی میں بدن ڈھالا تھا
جن سے تشہیر کا سامان بھی ہو سکتا ہے
پیار کے لفظ کا اپمان بھی ہو سکتا ہے
جن میں کچھ ایسے سوالات کئے تھے مجھ سے
آج تک جن کے جوابات مرتّب نہ ہوئے
سوچتا ہی رہا میں وقت گذرتا ہی رہا
پیار کے زخم کو میں عمر سے بھرتا ہی رہا

یہ تقاضہ ہے کہ میں پھیر دوں وہ سارے خطوط
جن کو آنکھوں میں لئے میں نے گذاریں راتیں
آج بھی جن کے لبوں پر ہیں تمہاری باتیں
انہیں وہ خط بھی ہیں جن کا کوئی مضمون نہیں !!
پھر بھی تنہائی میں اکثر یہ پڑھے جاتے ہیں
اور جینے کا سہارا سا بنے جاتے ہیں
تم مری طرح جو ممکن ہو تو مجبور نہ ہو
مصلحت ہے تو کم آمیز رہو دور رہو
میرے جینے کا سہارا تو نہ مانگو مجھ سے
خط اگر پھیر دیئے پھر بھی یہ اندیشہ ہے
یاد کرنے کی تمہیں خو تو نہیں جا سکتی
پھول کی پتیاں گرتی ہیں تو گر جائیں مگر
پھول کے جسم سے خوشبو تو نہیں جا سکتی

# "امانت"

یہ ماضی جو مری تنہائیوں کے ساتھ رہتا ہے
یہ ایک نادان بچے کی طرح تنہائی کو میری
مخاطب کرتا ہے تھوڑی سی پچکار کر اور کہتا ہے
وہ دیکھو گاؤں کے سینے پہ سر رکھے ہوئے ہم ہوں
تمہاری کسی بھی ہے جس کی گودی میں ہم ہوں
نقوش پا سے اب تک ہم گلی کی مانگ روشن ہے
ابھی تک گود پھیلائے ہوئے ڈیرے کا آنگن ہے

رسیلی جامنوں کے پیڑ کی کمزور شاخوں نے

تمہاری انگلیوں کا ہر نشاں محفوظ رکھا ہے

لبوں پر جھیل کی گہرائیوں کے ہے بس اک شکوا

کہ جب سے تم گئے ہو کوئی بھی ملنے نہیں آیا

کنارے جھیل کے وہ پیڑ اب تک منتظر سا ہے

کب آؤ گے یہاں کپڑے اُتارو گے نہاؤ گے

وہ بچھوؤں گاؤں کے کھیدانوں میں سویا ہوا جادو

نشیلی رات کی رانی وہ لو دیتی ہوئی خوشبو

دیوں کا وہ دھیمی دھیمی روشنی دینا دھواں دینا
شکستہ جھونپڑوں کا زندگی کو لوریاں دینا
کھنکتی ہیں رسوئی گھر میں الھڑ چھوڑ ھیاں اب بھی
بھرا کی پوٹلیاں لاتی ہیں سر پر بوڑھیاں اب بھی
تلیّہ کے کنارے کچّی اینٹوں سے بنا مندر
سلگتے کنڈوں سے اُٹھتی دھوئیں کی ملگجی چادر
ہرے کھیتوں کی مینڈوں پر سلگتے جسم کے سائے
لرزتے ہونٹ گھبرائے ہوئے سانسوں کو بہلائے

لچکتی آم کی شاخوں پہ بل کھائے ہوئے جھولے
کسی کا بھاگنا یہ کہہ کے کوئی ہے ہمیں چھولے"

وہ دیکھو زندگی کتنی حسیں ہے کیسی بھولی ہے
اسی آغوش میں آجاؤ جس میں آنکھ کھولی ہے

یہ ماضی جو مری تنہائیوں کے سارے ساتھی ہے
یہ کہتا ہے کہ میں گذری ہوئی باتوں میں کھو جاؤں
تمہاری زلف سے مہکی ہوئی راتوں میں کھو جاؤں

اسے میں کیسے سمجھاؤں کہ اب یہ سائنس کا دور

اک ایسی دھار کی تلوار ہے جس پر گذرنا ہے

مجھے اور زندگی کے زخم کو ٹانکے لگانا ہیں

اسے میں کیسے سمجھاؤں کہ یہ ماضی کی تصویریں

اب ایک ایسی امانت ہیں جسے میں رکھ نہیں سکتا

اگر رکھوں تو ناکارہ نکمّہ کہہ کے یہ دُنیا

مجھے ٹھوکر لگا دے اور خود آگے کو بڑھ جائے

مری پسماندگی پر ہر نظر اُٹھے ترس کھائے

مجھے مُردہ عجائب گھر کی ایسی مورتی سمجھے

جو سب کو اس لئے پیاری ہے کہ کافی پرانی ہے

یہ ماضی جو مری تنہائیوں کے ساتھ رہتا ہے

اسے میں کیسے سمجھاؤں کہ یہ ماضی کی تصویریں

اب اک ایسی امانت ہیں جسے میں رکھ نہیں سکتا

# "کھلونا"

دور سے ایک ناسمجھ بچہ
اک کھلونا سا کہ ٹوٹ جانے پر
اس طرح سے اداس بیٹھا ہے
جیسے میت قریب رکھی ہو
اور مرنے کے بعد ہر اک بات
مرنے والے کی یاد آتی ہو

جانے کیا کیا ذرا توقف سے
سوچ لیتا ہے اور روتا ہے
لیکن اتنی خبر کہاں اس کو
زندگی کے عجیب ہاتھوں میں
یہ بھی مٹی کا اک کھلونا ہے

# "وہ پاؤں"

پنڈت جواہر لال نہرو کی موت سے متاثر ہو کر لکھی گئی نظم

یہ فکر مند منازل یہ غم زدہ راہیں

یہ سوچتی ہیں کہ ایسے بھی پاؤں تھکتے ہیں

جو اٹھ گئے تو زمانے کی اٹھ گئیں آنکھیں

مسائلِ غمِ دُنیا کی جھک گئیں نظریں

گذرتے وقت نے سینے میں روک لیں سانسیں

وہ پاؤں جن کو ٹھہرنے کا تجربہ ہی نہ تھا

جو کائنات کی نبضوں کے ساتھ چلتے تھے

جو آندھیوں کے چراغوں کی طرح جلتے تھے

جیالا ہے جن سے ترقی کی مانگ کا سیندور

ہمیشہ ساتھ چلا جن کے رہبری کا شعور

کیا جنھوں نے مرتب حیات کا دستور

وہ پاؤں جن سے طریق مسافرت بدلا

نقوش جن کے ستاروں کی طرح صدیوں تک

فلک کی تیرہ فضائی کے کام آئیں گے

جو راہ دیکھتا ان فاصلوں کو چھوڑ گئے

جو آدمی نے بنائے ہیں آدمی کے لئے

وہ پاؤں نصف صدی جن کو جاگتے گذری

وہ پاؤں آج بڑی گہری نیند سوئے ہیں

کسی بہانے جواب ٹوٹ بھی نہیں سکتی

یہ فکر مند منازل یہ غم زدہ راہیں

یہ سوچتی ہیں کہ ایسے بھی پاؤں تھکتے ہیں

---

# "جوان نظریں"

وہ ایک ریلوے کوارٹر کی ایک کھڑکی سے
لگی ہوئی کوئی نادان نوجوان لڑکی
کھڑی ہے اور مجھے اس طرح دیکھے جاتی ہے
کہ جیسے میری نگاہوں میں اپنی نوعمری
ڈبو چکے تو کسی سے نظر ملائے گی
کس اعتماد سے اپنی نظر کی کشتی کو
مری نگاہوں کے طوفاں میں چھوڑ رکھا ہے
کہ میرے دل کی تہوں کو اُتر کے چھو آئے

# شعلہ

یہ کمسنی کی کیاری کا گُل بَدن شعلہ
حسیں تو نہیں ہے مگر جوانی نے
بہت گداز جسم کو چنگاریوں میں گوندھا ہے
نظر کو گرمیِ جذبات نے تپایا ہے
میں ایک ریل کے ڈبے میں جسکا کوارٹر ہے
برائے نام سَا کچھ فاصلہ رہا ہوگا
یہ بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ راستہ چلتا
میں اجنبی ہوں جیسے کوئی ہمسفر بھی مرا

نہ جانتا ہے نہ اپنائیت کی نظروں سے
غریب دل میں اُتر لینے کا قصد رکھتا ہے
مگر یہ فاصلہ اس اک جواں نظر میں نہیں
جو بارِ شرم اُٹھاتے ہوئے جھجکتی ہے
جو صرف میرے لئے بار بار اُٹھتی ہے
یہ لمحہ بھر کے لئے کہ مدتوں کے لئے
جوان نظروں کا آپس میں اک تعلق ہے
جسے بھلا کے یہ فطرت سے لڑ نہیں سکتیں
کہیں ملیں یہ مگر اجنبی نہیں ہوتیں

# ایک دوست کے خط کا
# منظوم جواب

مرے عزیز مرے درد آشنا علوی
بہت دنوں میں کسی بے نوا کی یاد آئی
میں سوچتا ہوں تو ایسا کوئی غلط بھی نہیں
کہ اس طویل خموشی نے کتنے شک چھوڑے
جنھیں قبول نہ کرنا بھی کتنا مشکل تھا
رفیق مری زندگی کے دانندہ!
مرے زندگی کا سمندر بڑا بھیانک ہے
یہ زندگی کناروں کو منتشر سمجھے
نہ جانے کتنے کنارے کوئی موج لپکے بیٹھ گئی
اور ایک روز کوئی موج لپکے بیٹھ گئی
بہت سے ایسے بھی آئے کہ جنکو لہروں نے
بھنور کی گود میں لے جا کے اپنا دم توڑا

مگر یہ دل یہ مری خواریوں کا سرمایہ
کسی عجیب سہارے کا منتظر ہی رہا
نہیں تو اس کے لئے ایک موج کافی تھی
مرے شفیق! مجھے تشنہ کام جان کے بھی
مری طرف سے تم اس درجہ بے نیاز رہے
وہ ہیں کہ جس کو زمانے میں بعد کوشش بھی
غموں کی دھوپ ملی جس نے پھونک پھونک دیا
وہ میں کہ جس نے کچھ ایسے بھی تیر کھائے ہیں
جنھیں گنوا کے تو پچھتائے ہونگے ترکش بھی
وہ میں کہ جس کو 'خرابِ حیات' کہنا بھی
اگر کسی کو گوارا نہیں تو رہنے دو
وہ میں کہ جس کے تبسّم میں زخم پلتے ہیں

جسے جلا کے بھی دنیا کے لوگ جلتے ہیں
جو اپنے چار طرف شعلہ و شرار لئے
نہ جانے کب سے اسی آس پر جیتا ہے
کہ شعلگی کہیں گلزار ہی نہ ہو جائے
وہ میں کہ جس کو تلاشِ نگاہِ مہر و خلوص
کہاں کہاں نہ پھری لیکے اس زمانے میں
مجھے بتاؤ کہ ایسے میں ایسی خاموشی
اگر گناہ نہیں ہے تو اس سے کم بھی نہیں
نفس نفس سے دھواں اُٹھ رہا ہے اے ہمدم!
خبر نہیں کہ یہ شعلہ کہاں بھڑک اُٹھے
جو ہو سکے تو مجھے ذہن سے جُدا نہ کرو
مجھے جلانے کی خاطر خطوط لکھتے رہو

---

انسانی حیات چونکہ حزنیہ ہے اس لئے یہ امر مسلم ہے کہ انسان زیادہ تر حزن و ملال
سے متکیف ہوتا ہے اتنا محض نشاطیہ جذبات سے نہیں۔ غم کی تسلیم شدہ حقیقت کو
میر تقی میر سے لے کر آج تک کے شعراء نے موضوع سخن بنایا ہے۔ ہماری شاعری میں اس
غم کی کہیں ہلکی اور کہیں گہری پرچھائیاں ملتی چلی آئی ہیں۔ میر کا غم داخلی غم ہے۔ یہیں وہ اس سے
بھی ہمیشہ ناکامیوں میں کام لیتا ہے۔ فانی کے ہاں یہ غم پرستی اور بھی داخلیت اختیار
کر لیتی ہے جب وہ اس غم انگیز حیات کو دیوانے کے خواب سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن ہمارے
اس عہد کا نوجوان مفکر وسیم بریلوی اس داخلی غم سے سماجی اور انسانی غموں کا نشاطیہ
درماں تلاش کرتا ہے۔ اس کے ہاں وہ فنکارانہ قلم ہے جو انسانی حیات کے اس حزنیہ پہلو کو
بھرپور تاثر کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہے اور ایک انبساط انگیز اور حوصلہ افزا
مستقبل کو جنم دینے کی سعی کرتا ہے۔

وسیم کے ہاں "غم" علامت مرگ ہوتے ہوئے بھی زندگی کا غماز ہے۔ اس نے
کوشش کی ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کے چھوٹے بڑے داخلی
اور خارجی مسائل غم کو صرف پیش کر کے چھوڑ نہ دے بلکہ ایسا راستہ بھی بنا دے جس پر چل کر
غم زدہ انسان دائمی مسرت کے پر نور افق کو چھو لے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ فنکار غم کی شراب سے انبساط کے وہ جام تیار کریگا جن سے
نہ صرف عہد حاضر سیراب ہو سکے گا بلکہ مستقبل کی پیاسی روحیں بھی آسودہ ہوں گی۔

شمیم کرہانی دلی